خطبہ اوّل

عالمی خلافت کی نوید

ذیلی عنوانات

- آیۂ استخلاف کا اجمالی تعارف
- فسق اور کفر کی حقیقت
- سورۂ صف کی آیات (۸۔۱۴) کا
- اجمالی تعارف
- نورِ خدا کے دشمن؟
- رسول اللہ ﷺ کا مقصد بعثت
- غلبہ دین اور جہاد وقتال
- دنیوی اور اخروی وعدے
- وعدۂ استخلاف کی تکمیل اوّل
- قافلہ سخت جاں، منزل بمنزل
- خلافت علیٰ منہاج النبوۃ
- ظالم ملوکیت کا دور
- جبر پر مبنی ملوکیت
- بالواسطہ غلامی کا دور
- دورِ سعادت کی نوید جاں فزا
- بیسویں صدی کی تاریخی اہمیت
- غلبہ دین اور احادیث مبارکہ
- عالمی خلافت
- اہل ایمان کا طلوع وغروب
- فلسفۂ ارتقاء اور غلبہ دین
- New World Order سے نظام خلافت تک
- دورِ سعادت سے پہلے
- بنی اسرائیل کے عذابِ استیصال میں تاخیر کی وجہ
- امت مسلمہ کے عروج وزوال کی تاریخ
- آنے والے عذاب کی جھلک
- نزول مسیحؑ اور خروج دجال
- پاکستان میں خلافت کا احیاء
- بھارت میں ہندومت کا احیاء
- نظام خلافت کب اور کہاں برپا ہوگا؟
- حادثات اور واقعات کا ظاہر و باطن
- یہود کے خواب اور ان کی تعبیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آیۂ استخلاف کا اجمالی تعارف

میں نے اپنے خطاب کے شروع میں جو آیات مبارکہ تلاوت کی ہیں ان میں سے پہلی سورۂ نور کی آیت ۵۵ میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۪ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًاؕ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْــٴًـاؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (النور: ۵۵)

''وعدہ کر لیا ہے اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور کئے ہیں انہوں نے نیک کام، کہ حاکم کر دے گا ان کو ملک میں جیسا حاکم کیا تھا ان سے گلوں کو اور جما دے گا ان کے لیے دین اُن کا جو پسند کر دیا ان کے واسطے اور دے گا ان کو ان کے ڈر کے بدلے میں امن۔ میری بندگی کریں گے، شریک نہ کریں گے میرا کسی کو اور جو کوئی ناشکری کرے گا اس کے بعد، سو وہی لوگ ہیں نافرمان۔''

اس آیۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کرنے والے مسلمانوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کو زمین میں ضرور خلافت عطا فرمائے گا۔ یہاں پر خلافت سے مراد مسلمانوں کی حکومت ہے۔

اس وعدے کے سلسلہ میں مزید وضاحت یہ فرما دی کہ یہ خلافت یا حکومت موجودہ امت مسلمہ (جو امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے) کو اسی طرح عطا کی جائے گی جس طرح اس سے پہلے کی امت مسلمہ (بنی اسرائیل) کو عطا کی گئی تھی۔[1]

[1] ہر خطبے کے حواشی اس خطبے کے اختتام پر درج کیے گئے ہیں!

اس آیت میں اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ہم نے اس سابقہ امت کو بھی حکومت عطا کی تھی، چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ﴾ (صٓ: ۲۶)

''اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ[2] بنایا۔''

گویا تاریخ کے حوالے سے بتایا جا رہا ہے کہ اے امت مسلمہ! تم میں سے جو لوگ ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کر دیں گے ہم انہیں لازماً خلافت عطا کریں گے جس طرح تم سے پہلوں کو عطا کی تھی۔

آیۂ مبارکہ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات نوٹ کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جو وعدہ فرمایا ہے اس کے لیے عربی زبان میں تاکید کا جو سب سے زیادہ مؤثر اور بلیغ اسلوب ممکن تھا اس کو تین بار استعمال کیا ہے۔

(i) ﴿لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ﴾

''انہیں ضرور بالضرور خلافت عطا کرے گا۔''

(ii) ﴿وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ﴾

''اور ان کے دین کو لازماً تمکن عطا کرے گا۔''

(iii) ﴿وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا﴾

''ان کی خوف کی حالت کو جو اس وقت ان پر طاری ہے، لازماً امن میں بدل دے گا۔''

دیکھئے یہ ایک ہی مضمون کی تکرار ہے، لیکن قرآن حکیم کی تکرار کی بھی ایک عجیب شان ہوتی ہے۔ جیسے کسی نے کہا ہے:

ع اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!

قرآن حکیم میں ایک ہی مضمون کو مختلف اسالیب میں بیان کیا جاتا ہے، مگر اس تکرار سے کلام کی تاثیر اور دلکشی میں کمی کی بجائے مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

پھر یہ جوفرمایا کہ ''اوران کے اس دین کوتمکن عطا کرے گا جواس نے ان کے لیے پسند کیا ہے'' تو یہ وہی بات ہے جوسورۃ المائدہ میں آئی ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ:۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کی تکمیل کر دی تم پر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کو (تا قیامِ قیامت) دین کی حیثیت سے پسند کیا۔''

اور ظاہر ہے کہ جس دین کو اللہ نے پسند فرمایا وہ مغلوب نہیں رہے گا بلکہ اس کو غلبہ اور تمکن حاصل ہوگا۔ یہ گویا وعدۂ استخلاف کی دوسری بار تاکید ہے۔

یہی بات تیسری بار اس طرح بیان فرمائی:

﴿وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا﴾

''ان کی خوف کی حالت کو (جو اس وقت ان پر طاری ہے) لازماً امن میں بدل دے گا۔''

سورۂ نور کی یہ آیات سن ۵ ھ کے اواخر سن ۶ ھ کے اوائل میں نازل ہوئی تھیں، اور جیسا کہ معلوم ہے سن ۵ ھ میں ہی غزوۂ احزاب پیش آیا تھا جب عرب کی مجموعی قوت نے تقریباً ایک ماہ اور کئی دن تک مدینہ کا شدید محاصرہ کر لیا تھا۔ ۱۲ ہزار کا لشکر مدینہ کی چھوٹی سی بستی پر حملہ آور ہوا تھا۔ مدینہ کے اردگرد یہود الگ سازشوں میں مصروف تھے، مسلمانوں پر شدید آزمائش کی گھڑی تھی۔ خود قرآن حکیم نے صورتِ حال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

﴿وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا﴾ (الاحزاب:۱۱)

''اہل ایمان شدید طور پر ہلا مارے گئے۔''

اس سنگین صورتحال کا نتیجہ یہ نکلا کہ منافقین کا نفاق ان کی زبانوں پر آ گیا گویا ان کا خبث باطن ظاہر ہو گیا۔ اس وقت یوں لگتا تھا جیسے لق و دق صحرا میں ایک دیا روشن ہے جسے بجھانے کے لیے ہر طرف سے آندھیاں چل رہی ہیں۔ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ ابھی ہوازن کا بڑا قبیلہ حملہ آور ہو جائے گا۔ نجد کے قبائل یورش کر دیں گے۔ کہیں خیبر کے یہودی ہی نہ ٹوٹ پڑیں یا پھر جنوب کی طرف سے قریش نہ چڑھ دوڑیں۔ یہ تھے وہ حالات جن میں یہ بشارت دی گئی کہ ان کی اس خوف کی کیفیت کو ہم امن سے بدل دیں گے۔

آیۂ مبارکہ کا یہ حصہ بہت ہی اہم ہے کہ (يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا) یعنی ''(جب میں ان کو غلبہ عطا کر دوں گا تب) وہ میری بندگی کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔'' یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی مسلمان اگرچہ خوف کی حالت ہی میں تھے لیکن بندگی تو اللہ ہی کی کرتے تھے، پھر اب غلبۂ دین اور خوف کے خاتمے کے ساتھ بندگی کو کیوں معلق کیا گیا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ توحید اس وقت تک ناقص ہے جب تک اللہ کا دین غالب نہ ہو جائے۔ قرآن حکیم نے اسی بات کو اسی طرح بیان کیا ہے (وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ) (انفال:۳۹) یعنی ''دین کل کا کل اللہ کے لیے ہو جائے۔'' غیر اللہ کی حاکمیت کی کاملاً نفی ہو جائے، اس لیے کہ غیر اللہ کی حاکمیت کا تصور ہی سب سے بڑا شرک ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ میں آیا ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ...... الْفٰسِقُوْنَ ...... الْكٰفِرُوْنَ﴾ (المائدہ:۴۴، ۴۵، ۴۷) یہی وجہ ہے کہ جب تک نظام خلافت قائم نہ ہو تب تک افراد تو موحد ہو سکتے ہیں، لیکن نظام بہر حال کافرانہ و مشرکانہ ہی رہتا ہے۔ چنانچہ دراصل توحید کی تکمیل ہی اس وقت ہوگی جب یہ تین وعدے پورے ہو جائیں گے۔

فسق اور کفر کی حقیقت

آیۂ مبارکہ کا اختتام اس طرح ہو رہا ہے: ﴿وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (اور جو اس کے بعد بھی کفر کریں وہ تو نہایت ہی سرکش لوگ ہیں) اس آیت میں ''فاسق'' بعینہٖ اسی معنی میں آیا ہے جس معنی میں ابلیس کو سورۂ کہف میں ''فاسق'' کہا گیا ہے: ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ﴾ (وہ جنات میں سے تھا تو اس نے اپنے رب کے حکم خلاف ''فسق'' (سرکشی) اختیار کیا) گویا یہاں فسق سرکشی اور بغاوت کے معنوں میں آیا ہے۔

اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ ''اس کے بعد بھی جس نے کفر کیا'' تو اس آیت میں کفر کا مفہوم بھی سمجھ لینا ضروری ہے۔ کفر دراصل دو معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو کفر اصطلاحی ہے، جس کا مطلب اسلام کا انکار، توحید کا انکار، رسالت کا انکار یا ضروریاتِ دین میں سے کسی کا انکار کرنا ہے۔ جب کہ دوسرا کفر وہ ہے جو شکر کے مقابلے میں آتا ہے، جیسے کہ قرآن حکیم میں آتا ہے:

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ﴾ (ابراہیم:۷)

''اگر تم میری نعمتوں کا شکر (اور قدر دانی) کرو گے تو میری طرف سے ان میں اور اضافہ ہوگا اور اگر کفر (کفرانِ نعمت) کرو گے تو پھر (یاد رکھو) میرا عذاب بڑا سخت ہے۔''

اسی طرح سورۂ لقمان میں بھی کفر، شکر کے مقابلے میں آیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ (لقمان:۱۲)

جس نے شکر کی روش اختیار کی تو اس نے اپنا ہی بھلا کیا اور جس نے کفرانِ نعمت کا وطیرہ اختیار کیا تو (اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ) اللہ غنی (حمد و شکر سے بے نیاز) ہے، حمید ہے (تمام اچھی صفات سے خود متصف ہے)۔''

لیکن سورۂ نور کی جس آیت پر گفتگو ہو رہی ہے اس میں کفر کے یہ دونوں ہی معانی مراد ہیں۔ چنانچہ یہ معنی بھی مراد ہیں کہ:

۱) ''جب اسلام کا غلبہ ہو جائے گا اور اس کے بعد بھی کچھ لوگ اگر کفر پر اڑے رہیں گے تو گویا وہ شیطنت کا مجسمہ ہیں۔'' کیونکہ غلبۂ کفر کی حالت میں تو کوئی عذر ہو سکتا ہے کہ آدمی مجبور ہے، حالات کے دباؤ کا شکار ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ دین کا دامن فقط اصحابِ ہمت ہی تھام کر رکھیں گے۔ یہی لوگ نظامِ باطل سے ٹکرانے کی ہمت کر سکیں گے۔ لیکن دین کے غلبہ کے بعد تو اکثریت کے لیے دین پر چلنا آسان ہو جائے گا۔ چنانچہ اس غلبے کے بعد بھی جو کفر پر اڑا رہے گویا اس میں سرے سے کوئی خیر ہے ہی نہیں۔

۲) اس کا دوسرا مفہوم بھی ہے جو ہم سے زیادہ متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری (یعنی اللہ تعالیٰ کی) طرف سے اتنے پختہ وعدوں کے بعد بھی اگر تم کمر ہمت نہیں باندھتے تو گویا ہمارے وعدوں کی بڑی ہی ناقدری کر رہے ہو۔

البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس آیتِ مقدسہ میں جو بھی وعدے ہیں، وہ مشروط ہیں۔ چنانچہ ان کے ساتھ ایمان اور عمل صالح کی شرط لگی ہوئی ہے، گویا نام کے مسلمانوں سے اللہ کا وعدہ نہیں ہے۔ ایمان اور عمل صالح کا وعدہ تم پورا کرو گے اور ان کا حق ادا کرو گے تو خلافت عطا کرنے کا وعدہ ہم پورا کریں گے۔[۳]

سورۂ صف کی آیات کا اجمالی تعارف

اب سورۂ صف کی آیات ۸ تا ۱۳ سے متعلق بھی چند باتیں عرض کرنی ہیں۔ پہلے ان آیات پر ایک نگاہ پھر ڈال لیں:

﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾

''چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کی روشنی کو اپنے منہ سے اور اللہ کو پوری کرنی ہے اپنی روشنی اور چاہے برا مانیں منکر۔ وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو سوجھ دے کر اور سچا دین کہ اس کو اوپر کرے سب دینوں سے اور چاہے برا مانیں شرک کرنے والے۔ ایمان والو! میں بتاؤں تم کو ایسی سوداگری جو بچائے تم کو دردناک عذاب سے۔ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور اپنی جان سے۔ یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ بخشے گا وہ تمہارے گناہ اور داخل کرے گا تم کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں اور ستھرے گھروں میں بسنے کے باغوں کے اندر یہ ہے بڑی مراد ملنی اور ایک اور چیز دے جس کو تم چاہتے ہو۔ مدد اللہ کی طرف سے اور فتح جلدی اور خوشی سنا دے ایمان والوں کو۔''

نورِ خدا کے دشمن؟

ان آیات میں پہلی آیت بہت اہم ہے۔ چنانچہ اس سے متعلق دو نہایت ضروری باتیں میں کسی قدر وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ یریدون (وہ چاہتے ہیں) کا فاعل کون ہے؟ اور ''وہ'' کا اشارہ کس کی طرف ہے؟ کن کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ وہ اللہ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا دینے کے درپے ہیں؟

اس آیت سے پہلے سورۂ صف میں سابق امتِ مسلمہ یعنی یہود کا تذکرہ چلا آ رہا ہے کہ انہوں نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کا برتاؤ کیسا تھا اور یہ کہ وہ اب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا معاملہ کر رہے ہیں۔ یہ سابقہ امتِ مسلمہ کے تین ادوار کا ذکر ہے جو سورۂ صف کے پہلے رکوع میں انتہائی جامعیت کے ساتھ آ گیا ہے۔ تو گویا اس آیت میں یہود ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں۔[۵]

پھر یہود ہی کے بارے میں یہ بات کیوں کہی گئی کہ وہ اللہ کے نور کو گل کرنا چاہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے جزیرہ نمائے عرب میں اس وقت مسلمانوں کے جو دشمن موجود تھے ان پر ایک نگاہ ڈالنی ہوگی۔ ان میں سے ایک تو مشرکین تھے جن کے سرخیل قریش مکہ تھے، مگر یہ بہت بہادر اور جری لوگ تھے، سامنے سے حملہ کرتے تھے۔ جب کہ دوسرے دشمن تھے یہود۔ یہ انتہائی بزدل تھے، ان کے بارے میں سورۂ حشر میں آیا ہے کہ ''یہ کبھی کھلے میدان میں مقابلہ نہیں کریں گے۔ ہاں چھپ کر قلعوں کے اندر سے پتھراؤ کریں گے۔'' ابوجہل نے تو اپنے دین کے لیے بہرحال گردن کٹوائی مگر ان میں اس کی ہمت نہیں یہ تو صرف پھونکوں سے کام چلانا چاہتے ہیں کیونکہ پروپیگنڈے اور سازشوں کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں۔ مگر ان کی سازشوں اور پروپیگنڈے کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ○﴾

''اللہ تعالیٰ اپنے نور کا اتمام کر کے رہے گا چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔'' [۶]

آیت کے اس پہلو پر زور اس لیے دے رہا ہوں کہ آج کے حالات میں بھی اسی صورتحال کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ گویا

آگ ہے، اولاد ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

بعینہٖ یہی کیفیت یہود کی آج بھی ہے۔ اس وقت صیہونیت جس طرح اسلام کے اس نور کو بجھانے کی فکر میں ہے اور جس تیزی سے یہود اپنے منصوبے روبہ عمل لا رہے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ دنیا کی سب سے بڑی حکومت Sole Supreme Power کے سر پر بھی وہی سوار ہیں۔ انہوں نے پوری دنیا میں Islamic Fundamentalism یعنی ''اسلامی بنیاد پرستی'' کا ہوا بنا کر کھڑا کر دیا ہے۔ یہ سب کچھ آج بھی آپ اس آیت کے بین السطور میں پڑھ لیجئے۔

رسول ﷺ اللہ کا مقصد بعثت

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ○﴾ ''وہی اللہ ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ (یعنی قرآن حکیم) اور دین حق دے کر تاکہ غالب کر دے اس کو کل کے کل دین پر یا پورے نظام زندگی پر خواہ مشرکوں کو یہ بات ناپسند ہو۔''

اس آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ حقیقت بڑی اہم ہے کہ جب تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت کا صحیح صحیح فہم حاصل نہ ہو، سیرۃ النبی ﷺ سمجھ میں نہیں آ سکتی، نہ ہی قرآن حکیم کا گہرا فہم وادراک حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ بات میں دراصل امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حوالے سے کہہ رہا ہوں، جنہوں نے اس آیہ مبارکہ کو پورے قرآن کا عمود قرار دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ کسی بھی بڑی شخصیت کے کارناموں اور کاوشوں کی قدر و قیمت معین کرنے اور ان کے اثرات کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کا مقصد معین ہو جائے۔ تب ہی تو آپ تجزیہ کر سکیں گے کہ وہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب رہی اور کتنی ناکام۔ نیز یہ کہ اس نے اپنا ہدف کس طور پر سے اور کس حد تک حاصل کر لیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت صرف تبلیغ نہیں ہے بلکہ غلبۂ دین حق ہے۔ ان دونوں باتوں میں زمین وآسمان کا فرق موجود ہے۔ اگر فقط تبلیغ کرنی ہوتی تو شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ہاتھ میں تلوار نہ لیتے۔ لیکن غلبۂ دین حق کے لیے میں تلوار ہاتھ لیے بغیر چارہ نہیں۔ اسی حقیقت کے منکشف ہونے سے تو ساری بات کھلتی ہے۔ تبلیغ تو بدھ مت کے بھکشو بھی کرتے ہیں۔ آخر یہ عیسائی مشنری والے بھی تو تبلیغ میں کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ مگر یہ تبلیغ جس سطح پر کر رہے ہیں اس میں کسی تصادم کی ضرورت نہیں پیش آتی، اس لیے کہ محض تبلیغ کے کچھ اور تقاضے ہوتے ہیں، جب کہ غلبۂ دین کے کچھ اور تقاضے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت ہی غلبۂ دین حق ہے۔ اسی لیے فرما دیا کہ یہ مشرکوں کو بہت ہی ناگوار ہوگا۔ یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہئے کہ مشرک ہے کون؟ ہر وہ شخص یا ادارہ جو دین حق کے مقابلے میں کوئی اور نظام آپ کے سامنے رکھے وہ مشرک ہے۔ مگر ہم نے شرک کو صرف چند عقائد تک محدود کر دیا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ!

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علم کلام

غلبہ دین اور جہاد وقتال

اللہ کا دین غالب ہوگا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت ہی غلبۂ دین ہے۔لیکن اس کے لیے سرفروشی، جانفشانی اور جہاد وقتال کے مراحل تو مؤمنینِ صادقین ہی کو طے کرنے ہیں۔چنانچہ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○﴾

(الصّف ۱۱۔۱۰)

''اے اہل ایمان! کیا میں تمہاری رہنمائی اس تجارت کی طرف کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلا دے؟ (پختہ) ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ۔اگر تم علم (حقیقی) رکھتے ہو تو تم (جان لوگے کہ) یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔''

سورۂ صف کی ان آیات پر ذرا ٹھہر کر ہمیں اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہئے۔سورۂ نور کی آیت ۵۵ میں نظام خلافت کے قیام کے لیے دو شرائط آئی تھیں، یعنی وعدہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ مشروط تھا۔اس مقام پر بھی دو ہی شرائط آئی ہیں، یعنی ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ۔وہ ایمان، وہ عمل صالح اور وہ جہاد کون سے ہیں جن سے یہ وعدے پورے ہو سکتے ہیں؟ افسوس ہے کہ ہمارے ذہنوں میں ایمان، عمل اور جہاد کے معنی بہت محدود اور مسخ شدہ ہیں، اس لیے ان کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔

دنیوی اور اخروی وعدے

سورۂ صف کی مذکورہ بالا آیات میں دو وعدے مذکور ہیں، جب کہ سورۂ نور کی آیت ۵۵ میں تین وعدے آئے ہیں مگر سورۂ نور میں جن وعدوں کا ذکر ہے ان کا تعلق دنیا سے ہے، یعنی اور اے مسلمانو! ہم تمہیں خلافت عطا کریں گے، دنیا میں تمہارا دین غالب ہو جائے گا اور دنیا میں تمہاری خوف کی کیفیت امن سے بدل دی جائے گی۔'' جب کہ سورۂ صف کی مذکورہ بالا آیات میں پہلے آخرت کا نتیجہ بیان کیا ہے، یعنی اے ایمان والو! اگر تم اللہ اور اس کے رسول پر حقیقی ایمان رکھو گے اور جہاد فی سبیل اللہ پر کاربند رہو گے تو وہ تمہارے گناہ بخش دے گا، تمہیں جنتوں میں داخل کرے گا اور ہمیشہ ہمیش کے باغات میں تمہیں نہایت پاکیزہ مسکن عطا کرے گا۔'' اور اسی اخروی نتیجہ کو بڑی کامیابی قرار دیتے ہوئے فرمایا: ﴿**ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ**﴾ اس طرح ہمارے معیار خیر وشر (Value Structure) کو بھی درست کر دیا گیا ہے کہ اصل کامیابی دنیا کی نہیں آخرت کی ہے۔اسی لیے آگے چل کر تقابل (Contrast) میں فرمایا: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا﴾ (ایک اور شے جو تمہیں پسند ہے)

اس موقع پر امام رازی نے تفسیر کبیر میں بڑی صراحت سے لکھا ہے کہ ''یہاں درحقیقت اس بات کی مذمت کی گئی ہے کہ یہ تمہاری بشریت ہے، جس کی وجہ سے تم دنیا کی فتح وکامیابی کو اہمیت دیتے ہو، مگر اللہ کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔اگر اہمیت ہوتی تو (اہل ایمان کو) آنِ واحد میں فتح عطا کر دیتا۔اللہ کی نگاہ میں تو تمہاری آزمائش اور امتحان کو اہمیت حاصل ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ کون اس آزمائش میں پورا اترتا ہے۔حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی آنکھوں سے فتح مکہ کا منظر نہیں دیکھ سکے تو کیا وہ ناکام ہو گئے! حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو مکہ میں ہی شہید ہو گئے، ان کو مدینہ کا دارالامن دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔لہٰذا اصل کامیابی ثابت قدمی ہے۔ایمان وعمل صالح کا حق ادا کرتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کر دینا ہی فوز عظیم ہے۔

اخروی کامیابی کی اہمیت واضح کرنے کے بعد دنیا سے متعلق وعدوں کا ذکر ہوا ہے:

﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

یعنی اللہ کی طرف سے مدد آیا ہی چاہتی اور فتح تمہارے قدم چوما چاہتی ہے اور اے نبیؐ! ہمارے مومن بندوں کو بشارت دے دیجئے کہ تمہاری سخت آزمائشوں کا زمانہ اب ختم ہوا چاہتا ہے۔تم نے ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کر دیا ہے اور جہاد کے تقاضے بھی پورے کر دیے ہیں۔

قرآن حکیم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب آزمائش انتہا کو پہنچ جاتی ہے، اور اہل ایمان اس میں بھی اپنی ثابت قدمی اور استقلال کا مظاہرہ کر دکھاتے ہیں تب اللہ کی مدد بلا تاخیر دستگیری کے لیے آجاتی ہے۔اسی اصول کے تحت اس آیت میں بھی مؤمنین کو فتح اور نصرت کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔

وعدۂ استخلاف کی تکمیلِ اوّل

آیئے اب یہ دیکھیں کہ تاریخی اعتبار سے یہ وعدۂ استخلاف و نصرت کتنی جلدی پورا ہوا۔ مذکورہ بالا آیات سن ۵ ھ کے اواخر یا سن ۶ ھ کے اوائل میں نازل ہوئیں۔ ۶ ھ کے ذی القعدہ میں صلح حدیبیہ ہوگئی اور قرآن نے اعلان کردیا﴿انا فتحنالك فتحامبينا﴾ (الفتح:۱)''اے نبی! ہم نے تم کو فتح مبین[7] عطا کی۔''۶ ھ کی صلح حدیبیہ کے فوراً بعد ۷ ھ میں خیبر فتح ہو گیا۔ مسلمانوں کی تنگدستی ختم ہوئی۔ پھر ۸ ھ میں خود مکہ فتح ہوگیا اور جزیرہ نمائے عرب میں اعلان کردیا گیا:﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (التوبہ:۱) یعنی ''مشرک کان کھول کر سن لیں کہ آج کے بعد سے ان کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہیں۔'' چنانچہ ایک سال کے اندر اندر جزیرہ نمائے عرب سے کفر و شرک کا خاتمہ کردیا گیا۔ سورۂ توبہ میں (Mopping up operation) کا اعلان کردیا گیا۔ کسی علاقے کے مفتوح ہوجانے کے بعد بھی کہیں کہیں مزاحمتی اور دفاعی مورچے (Pockets of resistance) باقی رہ جاتے ہیں، فتح مکہ کے بعد ان مزاحمتی مورچوں کی صفائی سن ۹ ھ میں ہوئی۔ اور پھر ۹ ھ کے اواخر یا ۱۰ ھ کے اوائل تک﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ (بنی اسرائیل:۸۱) کا بچشم سر مشاہدہ ہوگیا اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اللہ کا دین غالب ہوگیا۔ نظام خلافت کا وعدہ پورا ہوگیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ۲۴ برس کے اندر اندر دریائے جیحوں سے لے کر بحر اوقیانوس تک نظام خلافت غالب ہوگیا۔ گویا آیات استخلاف کے نزول کے بعد تیس برس کے اندر اندر معروف دنیا کے بہت بڑے رقبے پر وہ کیفیتیں پوری ہوگئیں جن کو﴿لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا﴾ کے بلیغ انداز میں بیان فرما دیا گیا تھا۔

قافلۂ سخت جاں، منزل بمنزل

یہ تو ہے وعدۂ استخلاف و نصرت کی تکمیل اولیٰ۔ البتہ اس کے بعد کیا ہوا، اس وقت سے اب تک ہم کن کن مرحلوں اور وادیوں سے گزرے اور اب ؎

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

یہ تیرہ سو اکتیس برس کی تاریخ ہے۔ ۶۳۲ ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، تیس برس خلافت راشدہ کے اور نکال دیجئے اس حساب سے تیرہ سو اکتیس سال بنتے ہیں[8]۔ اگر ہم اپنی کوشش سے اس ساری داستان کو بہت مختصر کر کے بیان کریں تو بھی بات بہت طویل ہوجائے، لیکن یہ کلام نبوی کی بلاغت ہے کہ ہم اس طویل تاریخ کو صرف ایک حدیث نبوی ﷺ سے سمجھ لیں گے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث مبارک میں اپنے زمانے سے لے کر قیامت تک پانچ ادوار کا ذکر کیا ہے۔ ہماری پوری تاریخ اس حدیث میں سمٹ کر آ گئی ہے۔ مسند احمد بن حنبلؒ کی روایت ہے جسے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے:((تکون النبوة فیکم ماشاء الله ان تکون، ثم یرفعها الله اذا شاء ان یرفعها)) (مسلمانو! تمہارے اندر نبوت رہے گی جب تک اللہ چاہے گا پھر جب اللہ چاہے گا اس نبوت کو اٹھائے گا) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے دور کا ذکر کیا ہے[9] ثم تکون خلافة علی منهاج النبوة (پھر خلافت ہوگی منہاج نبوت پر)

خلافت علی منہاج النبوۃ

اس کے الفاظ بہت قابل غور ہیں۔ اس دور کے لیے ہمارے ہاں معروف اصطلاح ''خلافت راشدہ'' ہے۔ تاہم یہ اصطلاح حدیث میں اس طرح نہیں آئی۔ ہاں ''خلفاء راشدین'' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، جیسا کہ مشہور حدیث ہے:((علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین))(میری سنت کا اتباع کرنا اور میرے خلفاء راشدین المهدیین کی سنت کا اتباع کرنا تم پر لازم ہے) لیکن حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیر مطالعہ روایت میں خلافت کی جو صفت آئی ہے وہ اتنی مشہور نہیں ہے۔ اللہ نے یہ توفیق ہم کو دی کہ ہم اپنی تقاریر اور مطبوعات کے ذریعے اس صفت کو عام کر رہے ہیں۔ خلافت علی منہاج النبوۃ کے معنی ہوں گے کہ ''بعینہٖ نبوت کے نقش قدم پر خلافت''۔ یہ ''بعینہٖ'' کا لفظ خصوصی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ خلافت راشدہ میں وہ نظام جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس قائم کیا تھا وہ بعینہٖ بتمامہٖ اور بکمالہٖ جوں کا توں قائم رہا۔

دورِ صدیقیؓ کی مثال

اس سلسلہ میں صرف ایک مثال دینا کافی سمجھتا ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد مبارک کے آغاز ہی میں مانعین زکوٰۃ کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے عظیم شخص نے بھی مصلحت اندیشی کا مشورہ دیا، کیونکہ دو محاذ پہلے ہی کھلے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی ﷺ نے ایک محاذ پر رومیوں سے جنگ کے لیے جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہہ کر روانہ کر دیا تھا کہ اس لشکر کے بھیجنے کا فیصلہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا، اس کا علم خود دست مبارک سے باندھا، میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔ دوسرا محاذ جھوٹے مدعیان نبوت کے خلاف کھل چکا تھا، ان کے کفر میں کسی شک کی گنجائش نہ تھی، چنانچہ ان سے تو لڑنا ہی تھا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ''اب تیسرا محاذ نہ کھولئے'' اس بات پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ردعمل (Reaction) بڑا ہی سخت تھا۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی ڈانٹ پلا دی۔ یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کا مقام ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی ہستی کو وہ ڈانٹ سکتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں کسی اور کا یہ مقام نہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے عمر رضی اللہ عنہ تم جاہلیت میں تو بڑے سخت تھے، اسلام میں آکر بزدل بن گئے؟ (أجبار في الجاهلية و خوار في الاسلام؟) اور دوسری بات جو آپؓ نے فرمائی دراصل اسی کو بیان کرنے کے لیے یہ سارا واقعہ میں نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: أينقص الدين وانا حي؟ (کیا میرے جیتے جی دین میں کمی کی جائے گی) آپؓ نے مزید فرمایا ''خدا کی قسم! اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زکوٰۃ کے اونٹوں کے ساتھ یہ ان کو باندھنے کی رسیاں دیتے تھے، مگر اب رسی دینے سے انکار کریں گے تو بھی میں ان سے جنگ کروں گا۔''

کمیونزم اب تو قصۂ پارینہ بن چکا ہے، لیکن اس کے زوال کا آغاز نظریات میں ترمیم سے ہوا تھا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ کمیونزم عالمی نظریہ کے بجائے روسی قوم پرستی (Russian Nationalism) کا لبادہ اوڑھ چکا ہے، چنانچہ تحریف کی ایک خشت کج نے پوری عمارت کو زمین بوس کر دیا۔

دور حاضر کی اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مؤقف پر غور کریں۔ آپؓ نے اظہار مافی الضمیر میں فصاحت و بلاغت کی بھی حد کر دی۔ کہاں اونٹ اور کہاں اس کی رسی، لیکن جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اتنی مداہنت یا ترمیم بھی گوارہ نہ تھی۔ آپؓ کے جذبات کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپؓ نے اعلان کر دیا تھا: ''خدا کی قسم! اور کوئی میرے ساتھ جائے یا نہ جائے میں تن تنہا جاؤں گا اور ان سے جنگ کروں گا۔'' آخر امت نے آپؓ کو 'افضل البشر بعد الانبياء بالتحقيق'' (بلاشبہ انبیاء کے بعد تمام انسانوں سے افضل) کا اعلیٰ مقام یونہی تو نہیں دے دیا تھا۔ آپؓ جیسا رقیق القلب انسان اس نازک موقع پر عزیمت و استقلال کا کوہ ہمالہ نظر آتا ہے۔

بہرحال اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ خلافت علی منہاج النبوۃ کے معنی حقیقتاً ہیں کیا اور اس سے فی الواقع مراد کیا ہے۔ اسی خلافت کو عرف عام میں خلافت راشدہ کہا جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے اپنی حدیث مبارک میں مزید فرمایا کہ یہ نظام بھی اس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا۔ اس کے بعد یہ بھی ختم ہو جائے گا۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس نکتے پر بھی غور کر لیں کہ کیا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دور بھی دورِ خلافت تھا یا نہیں؟ یقیناً آپؐ کا دور بھی خلافت ہی ہے۔ ہر نبی اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہوتا ہے۔ قرآن حکیم خود کہتا ہے: ﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ﴾ (ص:۲۶) (ترجمہ) ''اے داوٗد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا'' بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ خلافت اب ایک ''ماڈل'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱) (تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے) چنانچہ اب قیامت تک جو بھی نظام ہوں گے انہیں اسی کے حوالے سے پرکھا جائے گا۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسرے دور کا ذکر اس طرح فرمایا ہے: ((ثم يكون ملكا عاضا فتكون ما شاء الله ان تكون، ثم يرفعها الله اذا شاء ان يرفعها)) یعنی ''پھر ایک دور ملوکیت آئے گا اور یہ کاٹ کھانے والی ملوکیت ہوگی۔ یہ دور بھی اس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ جب چاہے گا، اسے بھی اٹھا لے گا۔''

ظالم ملوکیت کا دور

خلافت راشدہ یا خلافت علی منہاج النبوۃ کے بعد جس نظام کو عرف عام میں خلافت کہا جاتا ہے حدیث نبویؐ میں اسے ملوکیت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ تاہم اس دور کو ہم اس معنی میں خلافت کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کم از کم نظری طور پر کتاب و سنت کی مکمل بالادستی تسلیم کی جاتی تھی۔ اس قسم کی بالادستی خلافت بنوامیہ میں بھی اور خلافت بنوعباس میں بھی تھی اور خلافت عثمانیہ میں بھی یہ بالادستی قائم رہی۔ ہاں اقتدار کی منتقلی اور دولت کی تقسیم کا نظام عملاً بدل گیا تھا، اور دور بنواُمیہ کے ۹۰ برس دراصل عبوری مدت ہے۔ خلافت علی منہاج النبوۃ سے ملوکیت تک بات ایک دن میں نہیں پہنچی تھی۔ چنانچہ اصل ملوکیت تو بنوعباس کے دور میں شروع ہوئی۔

بنو امیہ کے مظالم

بہرحال بنوامیہ کی حکومت بھی یقیناً ظالم تھی۔ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ میدان کربلا میں جو کچھ ہوا اس سے تو بچہ بچہ واقف ہے، کیونکہ اس کا تذکرہ تو اہتمام کے ساتھ بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے۔ لیکن اسی جیسا سلوک حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ حرم مکہ میں ہوا، ان کو بے دردی سے ذبح کیا گیا اور ان کی لاش کو تین دن تک بے گوروکفن سولی کے تختہ پر لٹکا رکھا گیا۔ حرم مکی کی حرمت کو بٹہ لگایا گیا۔

اسی دور میں واقعۂ حرہ بھی پیش آیا۔ اس واقعہ میں تین دن تک مدینہ منورہ میں لوٹ مار کی گئی، خواتین کی بے حرمتی کی گئی اور حجاج بن یوسف کے ہاتھوں سینکڑوں تابعین شہید کئے گئے مگر میرے نزدیک اس سے بڑا ظلم یہ تھا کہ محمد بن قاسم کو سندھ سے واپس بلا کر شہید کر دیا گیا۔ وہ نوجوان تھا، لیکن اس قدر پارسا تھا کہ ہندوؤں نے اپنے معیار وعقیدہ کے مطابق اسے اوتار قرار دے دیا اور اس کی مورتیاں بنا کر پوجا شروع کر دی۔ ایسے متقی اور عادل حکمران کو اگر موقع مل جاتا تو پورا ہندوستان فتح ہو جاتا، لیکن اس سے ملوکیت کو بڑا خطرہ لاحق ہو جاتا۔ ملوکیت میں تو سوچنے کا انداز یہی ہوتا ہے کہ کسی شخص کا ہر دلعزیز ہونا تخت شاہی کے لیے خطرہ ہے۔ محمد بن قاسم کا یہی جرم تھا کہ وہ کشمکش اقتدار میں برسر اقتدار آنے والے بادشاہ کے مخالف گروپ میں شمار ہوتا تھا۔ جو کچھ محمد بن قاسم کے ساتھ ہوا بعینہٖ موسیٰ بن نصیر کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے شمالی افریقہ کا اکثر و بیشتر حصہ فتح کیا تھا۔ طارق بن زیاد موسیٰ بن نصیر کے ادنیٰ کمانڈر تھے۔ موسیٰ بن نصیر کو بھی ذلیل کیا گیا، دھوپ میں کھڑا کیا گیا، بہت بوڑھے تھے، بے ہوش ہو کر گر گئے۔ دونوں کو بادشاہت کے لیے خطرہ سمجھا گیا۔

بنو عباس کا تعیش

یہ تو حالت بنوامیہ کے دور کی ہے۔ اس کے بعد بنوعباس کے دور میں جو کچھ ہوا وہ بھی تاریخ کا حصہ ہے۔ جو ٹھاٹ اس دور میں جمے، رقص وسرود کی جو محفلیں سجائی گئیں، وہ سب کو معلوم ہیں۔ کوہِ قاف کا سارا نسوانی حسن بغداد کے محلوں میں کھنچا چلا آ رہا تھا۔ یہ ہے تیسرا دور جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ''کاٹ کھانے والی ملوکیت'' سے تعبیر کیا ہے۔

جبر پر مبنی ملوکیت

چوتھے دور کے بارے میں آپ ؐ نے فرمایا: ((ثم تکون ملکا جبریۃ ثم یرفعھا اللہ اذا شاء ان یرفعھا)) یعنی ''پھر ایک اور ملوکیت آئے گی وہ مجبوری والی ملوکیت ہوگی۔ پھر اس کو بھی اللہ جب چاہے گا اٹھا لے گا۔''

ان دو قسم کی ملوکیتوں میں کیا فرق ہے؟ اس سوال کے جواب کے سلسلہ میں ہمارے پاس نہ اس امر کی کوئی شہادت موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں کوئی سوال کیا گیا ہو، نہ یہ معلوم ہو سکا کہ اس زمانے میں ان دونوں ملوکیتوں کے درمیان کیا فرق سمجھا گیا، مگر آج کے حالات میں ہمارے سامنے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ ان سے مراد کیا ہے! پہلا دور ملوکیت وہ تھا جب ملوک مسلمان تو تھے، لیکن اس کے بعد جو ملوکیت ہم پر مسلط ہوئی وہ غیر مسلموں کی تھی۔ یہ مغربی استعماریت کا دور ہے۔ ہم برطانیہ کے غلام، فرانس کے غلام، اٹلی کے غلام اور ولندیزیوں کے غلام ہوتے چلے گئے۔ یہ چوتھا دور ہے جس کی اس حدیث مبارک میں خبر دی گئی ہے۔

بالواسطہ غلامی کا دور

یہ دور ابھی ختم نہیں ہوا۔ براہِ راست غلامی تو ختم ہوگئی، لیکن بالواسطہ یعنی (Rule By Proxy یا Indirect Rule) ابھی برقرار ہے۔ پوری امت مسلمہ ہنوز ان کے شکنجے میں ہے۔ ہماری معیشت اور وسائل ان کے قبضے میں ہیں۔ ہمارے دماغ ان کے قابو میں ہیں۔ ذہنی، فکری اور تہذیبی اعتبار سے ہم ان کے غلام ہیں۔ علم اور ٹیکنالوجی میں ہم ان کے بھکاری ہیں۔ دراصل یہ چوتھا دور جزوی طور پر ختم ہوا ہے، لیکن معنوی اعتبار سے اس کا تسلسل اب بھی جاری ہے اور اس غلامی کا جو حصہ باقی ہے وہ پہلے سے زیادہ تلخ اور اس کے شدائد اور مصائب پہلے سے کہیں بڑھ کر ہوں گے۔

دورِ سعادت کی نوید جاں فزا

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، حدیث مبارکہ کے مطابق بہرحال اس دور کو بھی ختم ہونا ہے اور اس کے بعد آپ ؐ نے آخری دور کا تذکرہ فرمایا ہے: ''ثم تکون خلافۃ علی منھاج النبوۃ'' (پھر خلافت علی منہاج النبوۃ کا دور آئے گا) یہ ہے وہ نوید جاں فزا، وہ خوشخبری جو موجودہ مایوس کن حالات کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنائی ہے۔

اس حدیث مبارکہ کے راوی حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بن بشیر عنہ فرماتے ہیں کہ ((ثم سکت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)) یعنی ''اس کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہوگئے۔'' اسی حدیث مبارکہ کو مولانا مودودی مرحوم نے قدرے تفصیل سے اپنی کتاب ''تجدید واحیائے دین'' میں نقل کیا ہے۔ اس روایت میں اضافی مضمون یہ ہے کہ:

''جب خلافت علیٰ منہاج النبوت کا نظام قائم ہو جائے گا تو لوگوں میں معاملہ سنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہوگا اور اسلام اپنے جھنڈے زمین میں گاڑ دے گا۔ آسمان والے بھی راضی ہو جائیں گے اور زمین والے بھی۔ آسمان اپنا ہر ہر (مبارک) قطرہ موسلا دھار بارش کی شکل میں زمین پر برسا دے گا اور زمین بھی اپنے تمام معدنی اور نباتاتی خزانے اگل دے گی۔''

گویا اس حدیث مبارکہ میں اس نظام خلافت کی اضافی شان وارد ہوئی ہے۔ افسوس مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے حوالہ نہیں دیا۔ میں اب تک امکانی کوشش کے باوجود حوالہ تلاش نہیں کر سکا۔

اگر اس وقت کے معروضی حالات کو دیکھا جائے تو یہ بشارت بالکل ناممکن الوقوع نظر آتی ہے۔ لیکن ہمارے ایمان کا تقاضا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم نے مان لیا ہے کہ وہ الصادق والمصدوق ہیں تو ان کی ہر خبر پر ایمان لانا لازم ہے۔ حدیث صحیح ہے، لہٰذا ایمان لانا ہے۔ شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ ہم یقین کریں یا نہ کریں، ہونا وہی ہے جس کی آپؐ نے خبر دی ہے۔

بیسویں صدی کی تاریخی اہمیت

اب چند باتیں بیسویں صدی کے حوالے سے بھی عرض کرنی ہیں۔ تاریخ انسانی میں بیسویں صدی سے زیادہ گھمبیر دور کوئی نہیں گزرا۔ اس صدی میں دو عظیم مملکتوں کا ایسا خاتمہ ہوا کہ نام ونشان تک مٹ گیا۔ صدی کے آغاز میں، سلطنت عثمانیہ جو تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی نسیاً منسیا ہوگئی، جب کہ اس صدی کے اختتام پر U.S.S.R. جیسی سپر طاقت ع ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا!'' کی تصویر بن گئی۔ کیا عجب کہ اسی صدی میں کوئی تیسری طاقت بھی اسی طرح پگھل کر رہ جائے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ امریکہ کا یہ انجام دور نہیں ہے۔ امریکی معیشت سخت بحران کا شکار ہے۔ اس کی معیشت کا اصل Lever یہود کے ہاتھ میں ہے۔ یہودی جب چاہیں گے ایک جنبش میں سب کچھ ختم کر دیں گے۔ میں تو ان حقائق کو دو اور دو چار کی طرح جانتا ہوں۔ وقت دور نہیں ہے جب وہ مسجد اقصیٰ کو منہدم کر کے اس کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کریں گے۔ مسلمان ممالک میں سے ان کے راستے میں کوئی مزاحم نہیں ہے۔ اگر مزاحم ہوگا تو امریکہ ہی ہوگا۔ لہٰذا وہ پہلے اس کا خاتمہ کریں۔ جو لوگ مغرب کے حالات کا مطالعہ صیہونی تحریک کے عزائم کے پس منظر میں کرتے ہیں وہ یقین کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ امریکہ کا یہ انجام دور نہیں ہے۔

بیسویں صدی عیسوی میں ہی دو عظیم جنگیں ہوئی ہیں، جن میں کروڑوں انسان قتل ہوئے۔ کیا تیسری جنگ نہیں ہو سکتی؟ نبی اکرم ﷺ نے احادیث مبارکہ میں الملحمۃ العظمٰی کی خبر دی ہے، اسے جنگ عظیم کہیں گے۔ اس لیے کہ عظمیٰ اعظم کا مؤنث ہے۔ حالات تیزی سے اس طرف جا رہے ہیں۔ دراصل یہ تیسری صلیبی جنگ ہوگی۔ احادیث مبارکہ کے علاوہ اس کا تذکرہ بائبل میں بھی موجود ہے۔

بیسیوں صدی کا تیسرا عجوبہ

اور بیسویں صدی ہی کا تیسرا عجوبہ یہ ہے کہ یہودی قوم جو دو ہزار سال سے دربدر تھی، اسے اس صدی میں گھر مل گیا۔ اسرائیل وجود میں آ گیا اور آیا بھی کس شان وشوکت سے! ۷۰ عیسوی سے یہودی بے گھر تھے۔ ٹائیٹس رومی نے یروشلم پر حملہ کیا تھا۔ ایک لاکھ سے زیادہ یہودی ایک دن میں قتل ہوئے۔ ہیکل سلیمانی مسمار کر دیا گیا جو اب تک مسمار پڑا ہے۔ اسی لیے یہودی اس کو اپنی تاریخ کا دورِ انتشار (Diaspora) کہتے ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ یہودی دنیا میں تیرہ چودہ ملین (یعنی ایک کروڑ تیس لاکھ) سے زائد نہیں ہیں۔ اس کے برعکس امت مسلمہ میں سے صرف عربوں کو شمار کیا جائے تو وہی بیس پچیس کروڑ ہیں، لیکن ان کی جو معنوی حقیقت ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ میں سوچا کرتا ہوں کہ شاید یہود کا موجودہ تسلط اور استیلاء بجھنے سے پہلے چراغ کی آخری بھڑک ہو۔ اس کے بعد شاید یہ مغضوب وملعون قوم تباہ وبرباد کر دی جائے۔

اہل ایمان کا طلوع وغروب

اگر اس صدی کے آغاز میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا تو کیا اس صدی کے اختتام پر احیائے نظام خلافت نہیں ہو سکتا؟ چنانچہ ہم بقول علامہ اقبال مرحوم یہ منظر دیکھ لیں کہ ؎

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے!

یہ نری شاعری نہیں، بلکہ تاریخی حقائق ہیں۔ جب اندلس (اسپین) میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکمرانی کا سورج غروب ہو رہا تھا تو اسی وقت مشرق میں اسلام کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

اسلام کو تو قیامت تک رہنا ہے۔حضور ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے کہ ''انا آخر المرسلین وانتم آخر الامم '' (میں آخری رسول ہوں اور تم آخری امت ہو) یہ امت کسی ایک نسل پر مبنی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عربوں کو معزول کیا تو اپنے دین کا پرچم ترکوں کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اب ترک اگر معزول ہو گئے ہیں تو کیا عجب اب یہ پرچم اسلام ہندیوں کے ہاتھوں میں آنے والا ہو، جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:

عطا مؤمن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی!

یہ منظر تاریخ انسانی پہلے بھی دیکھ چکی ہے

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

اور

اگر عثمانیوں پر کوہ ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

کوئی بعید نہیں کہ آفتاب خلافت جو اس صدی کے آغاز میں غروب ہوا وہ اس کے اختتام پر طلوع ہو جائے۔

مسلمانوں برعظیم کا استحقاق

بیسویں صدی کے حوالے سے آخری بات یہ ہے کہ جب خلافت کا برائے نام ادارہ بھی اغیار کی سازشوں اور اپنوں کی نادانیوں سے ختم کر دیا گیا تو ردعمل کہاں ظاہر ہوا؟ صرف اور صرف برعظیم پاک و ہند میں صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ خلافت کا ادارہ تو پورے عالم اسلام کی وحدت کا نشان تھا، اس لیے آنسو تو پورے عالم اسلام میں بہائے جانے چاہئیں تھے، لیکن کہیں کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا۔ اس ادارے کی بحالی کی تحریک چلی تو صرف اس صنم خانۂ ہند میں چلی اور اس شدت سے چلی کہ گاندھی کو بھی اس میں شریک ہونا پڑا۔ گاندھی نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر اس نے اس موقع پر مسلمانوں کا ساتھ نہ دیا تو آئندہ کبھی بھی ان کا تعاون حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ پورا برعظیم اس نغمے سے گونج اٹھا

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو!

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا خلافت کا یہ برائے نام ادارہ اپنوں کی غداری سے منسوخ ہوا تھا۔ بقول اقبال:

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

مصطفیٰ کمال پاشا نے اس وقت صہیونیت کے ایجنٹ کا کردار ادا کیا۔[11] ۱۹۲۴ء سے لے کر اب ۱۹۹۴ء تک ستر برس بیت گئے ہیں، لیکن پوری دنیا میں خلافت کے ادارے کا برائے نام وجود بھی نہیں۔ امت مسلمہ کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔

عالمی خلافت

جیسا کہ اس سے قبل بھی کہا گیا ہے کہ نظام خلافت ایک مرتبہ پھر برپا ہو کر رہے گا، لیکن اب جب بھی خلافت قائم ہوگی تو یہ دنیا کے کسی ایک خطے پر محدود نہیں ہوگی بلکہ عالمی خلافت ہو گی۔ اس لیے کہ صراحت کے ساتھ احادیث نبوی ﷺ میں اس کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ حدیث کے علاوہ خود قرآن حکیم میں اس کا صغریٰ کبریٰ[12] موجود ہے۔

قرآن حکیم میں یہ الفاظ مبارکہ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ تین مرتبہ ایک شوشے کے فرق کے بغیر وارد ہوئے ہیں۔ گویا یہ صغریٰ ہے۔

پھر قرآن مجید میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہ بات پانچ مرتبہ وارد ہوئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پورے عالم انسانی کے لیے ہے، جیسا کہ سورۂ سبا کی آیت ۲۸ میں ہے ﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّ نَذِيۡرًا﴾ یعنی ''اے نبیؐ! ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا۔'' یہ کبریٰ ہے۔ اس کو صغریٰ کے ساتھ جمع کیجئے، نتیجہ سامنے آجائے گا۔ بعثت محمدیؐ کا مقصد غلبہ دین ہے (صغریٰ) بعثت محمدیؐ تمام عالم انسانی کے لیے ہے، (کبریٰ) غلبۂ دین تمام عالم کے لیے ہے (نتیجہ)۔

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

اور جب یہ اتمام ہو جائے گا تو بساط عالم کا نقشہ کچھ اس طرح پر ہوگا ؎

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!!

گویا اس وقت ﴿يَعۡبُدُوۡنَنِىۡ لَا يُشۡرِكُوۡنَ بِىۡ شَيۡـئًا﴾ (النور:) کی تصویر سامنے آجائے گی۔

بعثت کا مقصد غلبۂ دین لازماً پورا ہوگا۔ مگر کب؟ اس کے جواب میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس وعدے کا اتمام ہماری آزمائش اور امتحان کی راہ سے گزرتا ہوا آگے بڑھے گا۔ چنانچہ ہمیں علامہ اقبال کا یہ پیغام یاد رکھنا چاہیے کہ ؎

غلبۂ دین اور احادیثِ مبارکہ

اب میں ان پیشین گوئیوں کا حوالہ دوں گا جو احادیث مبارکہ میں آئی ہیں۔ صحیح مسلم کی روایت ہے جس کے راوی حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ ہیں۔ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

ان اللہ زوی لی الارض فرایت مشارقھا ومغاربھا وان امتی سیبلغ ملکھا مازوی لی منھا)) (مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین کو سکیڑ دیا (یا لپیٹ دیا) تو میں نے زمین کے سارے مشرق اور سارے مغرب دیکھ لیے اور (سن لو) میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے زمین سکیڑ کر دکھائے گئے ہیں۔''

ایک دوسری حدیث مسند احمد بن حنبلؒ کی روایت ہے اور اس کے راوی مقدادؓ بن الاسود ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

((لایبقی علی ظھر الارض بیت مدرو لا وبر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام بعز عزیز اوذل ذلیل۔ اما یعزھم اللہ فیجعلھم من اھلھا اویذلھم فیدینون لھا)) (مسند احمد بن حنبل بسند صحیح)

''زمین کی پشت پر نہ کوئی اینٹ گارے کا گھر باقی رہے گا نہ کمبلوں سے بنا ہوا کوئی خیمہ جس کے اندر اللہ تعالیٰ اسلام کا کلمہ داخل نہ فرما دے، عزت دار کی عزت کے ساتھ یا مغلوبیت پسند کی مغلوبیت کے ساتھ۔ یا تو اللہ ان کو اس کلمہ کے ذریعے عزت دے گا تو وہ خود اس کلمہ کے حامل بن جائیں گے یا وہ ان کو مغلوب کر دے گا تو وہ اس کے مطیع اور تابع بن جائیں گے۔''

راوی حدیث (حضرت مقداد رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں تو میں نے (اپنے دل میں) کہا تب وہ بات پوری ہو جائے گی کہ ''دین کل کا کل اللہ کے لیے ہو جائے۔''

گویا احادیث مبارکہ کی ان پیشین گوئیوں کو سامنے رکھا جائے تو اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ کل روئے ارضی پر اللہ کا دین غالب ہوگا۔

فلسفۂ ارتقاء اور غلبۂ دین

اسی بات کو میں دو اور حوالوں سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات کا تعلق فلسفہ ارتقاء سے ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اپنی کتاب ''Idealogy of the Future'' میں فلسفۂ ارتقاء کے مختلف مراحل بیان کئے ہیں۔ ایک فلسفہ ارتقاء وہ ہے جسے ڈارون نے بیان کیا ہے۔ اس کے فلسفۂ ارتقاء کو ذہن سے نکال دیجئے، کیونکہ اس کے بعض گوشے ابھی تک حیاتیات کے میدان میں بھی مسلم نہیں سمجھے جاتے۔ تاہم جہاں تک تعلق ہے نفس ارتقاء کا تو اس کو سب سے پہلے بیان کرنے والے تو مسلمان فلسفی ابن مسکویہ ہیں۔ اس فلسفہ کو بعد میں مولانا روم نے بھی بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم ارتقاء کا پہلا مرحلہ Physical Evolution یعنی ارتقاء طبعی بیان کرتے ہیں۔ کائنات کی تخلیق کے جدید نظریات کے مطابق تخلیق کا ایک مرحلہ (Stage) وہ ہے جس سے پھر کیمیاوی مرکبات (Chemical Compounds) بنے ہیں۔ ان سے جب نامیاتی مرکبات (Organic Compounds) وجود میں آ گئے جن میں حیات کی صلاحیت تھی تو گویا Physical Evolution اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ اب حیات کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد ارتقاء کا Second Phase ہے ''حیاتیاتی ارتقاء (Biological Evolution)'' ڈارون کی بحث اسی Phase تک محدود ہے۔ انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی یہ ارتقاء بھی اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ اس سے آگے حیاتیاتی ارتقاء کی کوئی منزل نہیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے جس مرحلہ ارتقاء کا ذکر کیا ہے (وہ اسے ایک مرحلہ کہتے ہیں، مگر میں اسے دو مرحلوں میں تقسیم کرتا ہوں) وہ مرحلہ ہے نفسیاتی اور ذہنی ارتقاء یا Psychological and Intellectual Evolution کا مرحلہ۔ میرے نزدیک اسی مرحلے کا انتہائی عروج حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک لے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین نسبتیں ہیں، یعنی (i) خلیل اللہ[13] (ii) امام الناس اور (iii) ابوالانبیاء، یعنی ان کے بعد تمام انبیاءؑ انہی کی نسل سے ہوئے ہیں چاہے وہ بنی اسرائیل میں سے ہوں، چاہے بنی اسمٰعیل میں سے ہوں یا بنی مدین میں سے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رسالت کی تکمیل ہوئی ہے۔ آپؐ نے ایک معاشرے کو وہاں تک بلند کر دیا جہاں تک اللہ تعالیٰ نے آپ کو رفعت عطا فرمائی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم ہلاک ہوئی، اسی طرح ہود علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کی قومیں ہلاک ہوئیں، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قوم کو بلندی تک لے گئے اور ایک معاشرہ قائم کیا ہے۔ یہ وہ کمال ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دکھایا ہے۔

اب اس سے اگلی بات وہ ہے جس کو ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے بیان کیا ہے۔ ارتقاء کا اب صرف ایک امکانی Phase اور ہے، یعنی Globalization of the Revolution of Mohammad۔ مطلب یہ کہ دنیا کا عمرانی ارتقاء اس انتہا کو پہنچ جائے گا جس کی جھلک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھائی تھی اور نوع انسانی کی اجتماعی یادداشت میں جس کو ایک خوشگوار خواب کی حیثیت حاصل ہے۔ آپؐ نے جو معاشرہ قائم کیا تھا اس کی بنیاد پر ۱۹۳۷ء میں گاندھی نے اپنے اخبار ہریجن میں ایک مقالے میں کانگریسی وزراء کو خطاب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ: ''میں آپ لوگوں کے سامنے ابوبکر و عمر کی مثال پیش کرتا ہوں۔'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظام قائم کیا وہاں تک تو ابھی انسانی فکر پہنچ بھی نہیں سکی ہے۔ علامہ اقبال نے صورت حال کی صحیح صحیح تعبیر کرتے ہوئے کہا ہے:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
زاں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ ست![14]

گویا انسانیت کے دامن میں جو خیر اور بھلائی ہے وہ نورِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے مستعار ہے، یا پھر انسانیت ابھی اس طرف جا رہی ہے جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چودہ سو برس پہلے ہی پہنچا دیا تھا۔ یہ ہے ارتقاء کی آخری منزل، لہٰذا فلسفۂ ارتقاء کے حوالے سے بھی ''نظام خلافت'' کا احیاء لازمی ہے۔

New World Order سے نظام خلافت تک

اب ہم ایک اور اعتبار سے غور کرتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں نئے عالمی نظام کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔ خلیج کی جنگ کے بعد اس کا شور کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ صنعتی اور سائنسی ترقی کی وجہ سے فاصلے معدوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ پوری دنیا نے ایک شہر کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اسی وجہ سے سوچا جا رہا ہے کہ پوری دنیا کے لیے کوئی ایک نظام بھی تو ہونا چاہئے۔ اسی غرض سے پہلی جنگ عظیم کے بعد League of Nations وجود میں آئی، لیکن چونکہ اس نظام کے لیے انسان کے پاس کوئی فکری بنیاد نہیں، لہٰذا وہ جلد ہی ناکام ہو گئی۔[۱۵]

''انجمن اقوام'' کی ناکامی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک اور ادارہ تنظیم اقوام متحدہ (United Nations Organization) کے نام سے وجود میں آیا۔ یہ بھی عالمی نظام کے قیام کی ایک کوشش ہے۔ مگر یہ ادارہ بھی ناکام ہو چکا ہے، اب اس کی حیثیت امریکہ کے گھر کی لونڈی سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ اب یہ New World Order آیا ہے، یہ بھی اسی ارتقاء کی طرف ایک پیش قدمی ہے۔ اگرچہ یہ نیا عالمی نظام ابھی تک پوری طرح جڑ نہیں پکڑ سکا، تاہم عالم اسلام پورے کا پورا اس کی گرفت میں آ چکا ہے۔ البتہ چین، جاپان اور شمالی کوریا کو زیر نگیں کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔

یہ New world order درحقیقت Jew world order ہے۔ یہ ۱۸۹۷ء میں پروٹوکولز کا جو نقشہ ''صیہونی اکابر'' (Elders of the Zion) نے بنایا[۱۶] تھا، وہی تدریجاً روبعمل آ رہا ہے۔ ۱۹۱۷ء کا اعلان بالفور،[۱۷] پھر ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام، ۱۹۶۷ء میں عربوں سے جنگ اور اسرائیل کی فتح، یہ سارے واقعات ایک تدریجی عمل کا حصہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل یروشلم کے سوا تمام معاملات پر گفتگو کے لیے تیار ہے۔ ''جریکو میں اپنی قومی حکومت بنا لو'' ''غزہ میں بھی Self Rule لے لو'' غرض ''سب کچھ منظور ہے، مگر بات نہیں ہو گی تو یروشلم کے بارے میں، یہ ہمارا اٹوٹ انگ ہے۔''

میرے نزدیک تو شاید چند سال کی بات ہے کہ مسجد اقصیٰ گرائی جائے گی۔ اس کی جگہ وہ ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ تقریباً دو ہزار سال سے ان کا یہ ''کعبہ'' گویا گرا پڑا ہے۔ اسرائیلی وہاں جاتے ہیں اور رو دھو کر واپس آ جاتے ہیں، وہاں جا کر اسرائیلی دیوار گریہ سے سر ٹکراتے ہیں۔ اگرچہ یہ ٹکریں Symbolic ہوتی ہیں، تاہم Movement تو ایسی ہی بناتے ہیں جیسے کہ سچ مچ ہی ٹکریں مار رہے ہوں۔ اب وہ اسے تعمیر کریں گے۔ مسجد اقصیٰ اب ان کے لیے گرانا مشکل نہیں رہا۔ اس لیے کہ بابری مسجد گرا کر انہوں نے مسلمانوں کی نبض پر ہاتھ رکھ کر دیکھ لیا ہے کہ ان میں کوئی جان نہیں ہے۔ بس عالم عرب کے کچھ جوشیلے نوجوان احتجاج کے لیے کھڑے ہوں گے۔ انہیں بھوننے کے لیے اسرائیل کو اپنی گولیاں بھی ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کے لیے حسنی مبارک موجود ہے، شاہ فہد صاحب ہیں، اور بھی جو اُردن اور مراکش کے بادشاہ اور الجزائر کے ڈکٹیٹر ہیں۔ اس فہرست میں اب پی۔ ایل۔ او کے صدر یاسر عرفات کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس ساری گفتگو سے نتیجہ یہ نکال رہا ہوں کہ New World Order جو درحقیقت Jew World Order ہے وہ ایک دفعہ تو قائم ہو گا، لیکن قائم ہونے کے بعد اسے Just world order of Islam میں بدلنا اگلا قدم ہو گا۔

اس تبدیلی کو ایک مثال سے سمجھ لیجئے، فرض کیجئے آپ کو سو آدمیوں کو مسلمان بنانے کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔ اب اگر یہ سو آدمی بالفرض ایک آدمی کی شکل اختیار کر لیں یا کسی ایک آدمی کا مسلمان ہونا سب کی مسلمان ہونے کا وسیلہ بن جائے تو آپ کا کام کتنا آسان ہو جائے گا۔ اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھیے دنیا عالمی نظام کی طرف جا رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عالمی نظام کی طرف لانا صرف ایک Shift over کی بات رہ جائے گی۔ اس طرح نبی ﷺ کی دی ہوئی خبر کی صداقت ثابت ہو جائے گی۔ وہ اسلام کا عالمی نظام ہو گا اور اسی نظام کو حضور ﷺ نے ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کا نام دیا ہے۔

دورِ سعادت سے پہلے

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ بہت ہی خوش آئند ہے کہ اللہ کا دین پورے کرۂ ارض پر غالب ہو گا۔ لیکن اس عظیم کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے پہلے کن دردناک حالات سے گزرنا ہو گا اور گوہر بننے سے قبل قطرے پر کیا کچھ گزرے گی، یہ دردناک باب ہے، اس کی خبریں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دی ہیں۔ افسوس کہ احادیث کی طرف ہمارا رجحان ہی نہیں ہے۔ عوام کا تو خیر ذکر ہی کیا کئی علماء نے بھی مجھے بتایا کہ ''یہ جو کتب احادیث کے آخر میں ''کتاب الفتن'' ''کتاب الملاحم'' اور ''علامات الساعۃ'' کے عنوان سے ابواب آتے ہیں ہم انہیں پڑھتے ہی نہیں۔ علماء کا سارا زور احادیث کے فقہی مباحث پر صرف ہو جاتا ہے۔ حالانکہ احادیث صحیحہ اور متواترہ میں جو خبریں اور پیشین گوئیاں موجود ہیں ان سے صرف نظر کا کیا جواز ہے؟ بات یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی علیہ ما علیہ نے احادیث نزول مسیح علیہ السلام کی جو تو جیہہ کی اور پھر خود ہی مسیح بن بیٹھا، اس سے عام مسلمان کہتے ہیں کہ ان باتوں کو سرے سے چھوڑ ہی دو، ان میں پڑنے کی ضرورت کیا ہے جس سے اہل فتنہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جب کہ یہ باتیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں بہت اہم ہیں، ان سے استغناء برتنا گویا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مرتبہ کو کم کرنا ہے۔ بہرحال احادیث مبارکہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو آنے والا وقت مغربی سامراج کی غلامی سے بھی زیادہ سخت ہو گا۔

میں اپنی بات کو اگر ایک جملے میں بیان کروں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ عالمی خلافت سے قبل دو مسلمان امتوں کو ان کی سزاؤں کی آخری قسط ملنی ہے۔ اس جملہ کی مختصر تشریح کے سلسلہ میں پہلا سوال تو یہی ہے کہ وہ دو مسلمان امتیں کون سی ہیں؟ تو ذرا سورۂ نور کی آیت ۵۵ جس کا حوالہ پہلے آ چکا ہے، اس پر ایک نظر ڈال لیجے۔ اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

﴿...... لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ......﴾

''......ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے......''

گویا پہلے بھی ایک امت مسلمہ تھی۔ اور اگر میری بات کا غلط مفہوم نہ لیا جائے تو کہوں گا کہ بعض اعتبارات سے سابقہ امت مسلمہ ہم سے افضل تھی، بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اسے فضیلت مطلقہ حاصل تھی۔ جس طرح جزوی فضیلت تو کسی نبی کو حاصل ہو سکتی ہے، لیکن کلی اور مطلق فضیلت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حاصل ہے۔ چنانچہ سابقہ امت مسلمہ کے لیے قرآن حکیم میں دو جگہ ارشاد ہوا ہے:

﴿وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِينَ﴾ (البقرہ: ۴۷، ۱۲۲)

''میں نے تم کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی۔''

جبکہ ہمارے لیے جو الفاظ آئے ہیں وہ صرف یہ ہیں:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا......﴾ (البقرہ: ۱۴۳)

''اور ہم نے تم کو ''امت وسط'' بنایا۔''

دونوں آیات کے تیور اور کلمات کے فرق کو دیکھئے!

اس کے علاوہ یہ پہلی امت وہ امت ہے جس میں ۱۴ سو برس تک نبوت کا سلسلہ نہیں ٹوٹا۔ ۱۴ سو قبل مسیح دو رسولوں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے یہ سنہری زنجیر شروع ہوئی اور اس زنجیر کے اختتام پر بھی دو ہی نبی حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ (علیہما السلام) موجود تھے۔ اس سنہری زنجیر کے درمیان جب بھی کوئی نبی فوت ہوا تو کوئی نبی ہی اس کا جانشین بنا۔ اس سابقہ امت کی تاریخ ۳۴ سو برس پر محیط ہے۔ چودہ سو سال قبل مسیح میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات ملی تھی۔ بنی اسرائیل تو پہلے بھی موجود تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نبی تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے درمیان کسی نبی کا تذکرہ نہیں ملتا، [۱۸] لیکن بنی اسرائیل کے ۱۲ قبیلے تو موجود تھے۔ پھر تورات ملنے کے بعد ان کو امت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِبَنِيْ إِسْرَآءِيْلَ أَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا﴾ (بنی اسرائیل: ۲)

''اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اور اس (کتاب) کو بنی اسرائیل کا رہنما بنایا کہ (دیکھو) میرے سوا کسی کو سرپرست نہ بنانا۔''

گویا یہاں سے امت کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔

اس امت کو ایک ہی کتاب نہیں دی گئی بلکہ کئی کتابیں دی گئیں۔ دو کتابیں تو وہ ہیں جن پر ہمارا بھی ایمان ہے، زبور اور انجیل......ان کے علاوہ متعدد صحیفے بھی عطا کئے گئے۔

یہ ہے وہ سابقہ امت مسلمہ جس کی فضیلت کے لیے قرآن حکیم میں مذکورہ بالا آیت دو مقام پر آئی ہے۔ بالکل اسی طرح دو ہی دفعہ یہ مضمون بھی آیا ہے:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (البقرہ: ۶۱)

''ان پر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔''

ایک طرف ان کو یہ فضیلت دی گئی اور دوسری طرف وہی قوم مغضوب و معلوم قرار پا گئی۔ سورۂ فاتحہ کے کلمات ''مغضوب علیہم'' کی تفسیر میں سب متفق ہیں کہ ان سے مراد یہود ہیں اور ''الضالین'' سے مراد نصاریٰ ہیں۔ قرآن حکیم میں آتا ہے:

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْ إِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ......﴾ (المائدہ: ۷۸)

''داؤد علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم کی زبانی بنی اسرائیل میں سے ان لوگوں پر لعنت کی گئی جنہوں نے کفر کیا۔''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ دراصل اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کے کچھ قوانین ہیں جن کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قانون عذاب کے سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ یہ دنیا افراد کے لیے دار الجزاء نہیں ہے، جب کہ قوموں کے لیے دار الجزاء ہے۔ افراد کے لیے عذاب و ثواب کا فیصلہ آخرت میں ہو گا۔ آخرت میں ہر شخص انفرادی حیثیت میں آئے گا، لیکن اقوام کے گناہوں کا حساب اکثر اس دنیا میں ہی چکا دیا جاتا ہے۔ بقول علامہ اقبال:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف

پھر قوموں پر دو طرح کے عذاب آتے ہیں۔ایک بڑا عذاب، جسے قرآن مجید ''العذاب الاکبر'' کہتا ہے،اسے عذاب استیصال بھی کہہ سکتے ہیں۔اس عذاب میں قوموں کا نام و نشان مٹا دیا جاتا ہے، یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ یہ عذاب صرف ان قوموں پر آتا ہے جن کی طرف کسی رسول کو مبعوث کیا گیا ہو اور قوم نے بحیثیت مجموعی رسول کی دعوت کو ٹھکرا دیا ہو۔قوم نوح علیہ السلام، قوم صالح علیہ السلام، قوم ھود علیہ السلام، قوم علیہ السلام قوم لوط علیہ السلام اور آل فرعون اسی عذاب استیصال سے دوچار ہوئے۔اور یہ چھ مثالیں قرآن مجید میں پندرہ مرتبہ بیان کی گئی ہیں۔

اس سے کم درجے کا عذاب آتا ہے اس مسلمان امت پر جو زمین پر اللہ کی نمائندہ ہونے، حامل کتاب الٰہی ہونے اور وارث علوم نبوت ہونے کے باوجود اپنے عمل سے اپنے دعوؤں کی تکذیب شروع کر دے۔ظاہر ہے کہ اس سے بڑا مجرم کوئی نہیں۔ باقی نوع انسانی کی گمراہی اور جرائم کی ذمہ دار بھی یہی قرار پاتی ہے۔ کیونکہ پیغام حق پہنچانا اس کا فرض تھا۔اگر وہ یہ پیغام حق بے کم و کاست پہنچا دیتی اور پھر دنیا نہ مانتی تب تو انکار کرنے والے مجرم قرار پاتے اور وہ امت بری الذمہ سمجھی جاتی۔مگر جب اس امت مسلمہ نے پہنچانے کا فرض ادا نہیں کیا تو اب مجرم وہ خود بن گئی کہ اللہ کی زمین پر اس کی نمائندگی کی دعویدار بھی ہے اور عمل اس کے برعکس ہے۔اس سے بڑا جرم اور کوئی نہیں۔اسی کی پاداش میں وہ عذاب ہے جو بنی اسرائیل پر آیا اور جو امت محمدؐ پر آیا۔

اس موقع پر میں ایک عظیم حدیث مبارکہ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ یہ حدیث دراصل بہت بڑے خزانے کی کلید ہے،اس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''میری امت پر وہ سارے حالات وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر وارد ہوئے بالکل ایسے جیسے ایک جوتی کا تلا دوسری جوتی کے بالکل مشابہ اور برابر ہوتا ہے۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت کی انتہا ہے۔ جوتی کا جوڑا اگر اوپر سے دیکھا جائے تو ان کے چھوٹے بڑے ہونے کا فرق نظر نہ آئے گا، لیکن جب ان کے تلے جوڑ کر دیکھا جائے گا تو جوڑی کا فرق معلوم ہو جائے گا،اور اگر صحیح جوڑی ہوئی تو دونوں کے تلوں میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

تاریخ کے مطالعہ سے اس حدیث کے کلید ہونے کی حیثیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک بنی اسرائیل پر دو عروج کے دور آ چکے تھے اور زوال کے بھی دو ہی دور بیت چکے تھے۔سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں ان دو ادوار کا ذکر ہے۔فرمایا:

﴿وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا۝﴾

پہلے اشوریوں کے ہاتھوں اسرائیل کی حکومت ختم ہوئی۔اس کے بعد کلدانیوں کے ہاتھوں تباہی آئی۔ چھ سو برس قبل مسیح بخت نصر کے ہاتھوں چھ لاکھ انسان یروشلم میں قتل ہوئے اور چھ لاکھ کو وہ قیدی بنا کر لے گیا۔ یروشلم میں ایک متنفس نہیں چھوڑا۔ ہیکل سلیمانی کو مسمار کر کے ہموار کر دیا۔اس کی بنیادیں تک کھود کے پھینک دیں۔اس کے بعد حضرت عزیز علیہ السلام نے توبہ کی دعوت و منادی دی،جس پر یہ جاگے اور اللہ کے حضور توبہ کی۔تب سائرس کے ہاتھوں اللہ نے بابل کی اسیری سے نجات دلائی۔اس کے بعد یہ یروشلم آئے اور ہیکل سلیمانی، جو ان کے ہاں کعبے کا درجہ رکھتا ہے، دوبارہ تعمیر کیا۔ یہ ان کا دوسرا دور عروج ہے۔لیکن انہوں نے پہلے کی طرح پھر کتاب اللہ کو پیٹھ دکھائی،عیاشیوں اور بدمعاشیوں میں مبتلا ہوئے اور طاؤس و رباب میں غرق ہو کر تباہی کے اسی راستے پر چل پڑے جس کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر!

لہٰذا پھر عذاب کا کوڑا برسا۔ یہ عذاب کا کوڑا پہلے یونانیوں، پھر رومیوں کے ہاتھوں برسا۔ پہلے دور میں سزا آشوریوں کے ہاتھوں آئی جو شمال سے آئے تھے، پھر مشرق سے کلدانی آئے۔ بخت نصر بابل کا بادشاہ تھا۔ دوسرے دور میں پہلے عذاب کے کوڑے یونانیوں کے ہاتھوں برسے اور پھر رومیوں کے ہاتھوں ۷۰ء میں ٹائیٹس رومی نے جو حملہ کیا اس میں ایک لاکھ تینتیس ہزار یہودی ایک دن میں قتل ہوئے، باقی یہودیوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔اس وقت کے بعد سے اب جا کر اس صدی میں انہیں اپنا گھر نصیب ہوا ہے۔ یروشلم میں ان کا داخلہ بند تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بیت المقدس فتح ہوا تب جا کر یروشلم میں داخلے کی اجازت ملی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے ''Open City'' قرار دیا، ورنہ پورے ساڑھے پانچ سو برس تک کوئی یہودی اپنے مقدس شہر میں داخل بھی نہ ہو سکتا تھا۔ بہرحال یہ ہے اس وقت تک کی تاریخ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔

بنی اسرائیل کے عذاب استیصال میں تاخیر کی وجہ

حضرت مسیح علیہ السلام ان کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔سورۂ آل عمران (آیت ۴۹) میں ہے: ورسولا الی بنی اسراء یل (یعنی بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے رسول) انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت کو رد کر دیا، بلکہ اپنی طرف سے تو گویا ان کو سولی پر چڑھا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ان کو زندہ آسمان پر اٹھالیا، لہٰذا اسی وقت سے یہ قوم عذاب استیصال کی مستحق ہو چکی ہے۔ سورہ بنی اسرائیل ہی کے دوسرے رکوع میں آیا ہے:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۱۵)

یعنی ''ہم اس وقت تک عذاب (استیصال) نہیں نازل کرتے جب تک ہم اپنا رسول نہ بھیج دیں۔''

جیسا کہ واضح کیا گیا کہ رسول آ چکا اور انہوں نے اس کو رد بھی کر دیا، لیکن ایک خاص سبب سے اس قوم پر اس طرح کے عذاب کی نہ اس وقت تنفیذ ہوئی نہ اب تک ہوئی۔ بات یہ ہے کہ قرآن حکیم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں ان کے لیے ایک رحم کی اپیل (Mercy Appeal) کا موقع پیدا کیا۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے:

﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ○ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۸،۹)

یعنی ''اب بھی دامن محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں پناہ لے لو، قرآن پر ایمان لے آؤ، جو ہر معاملے میں سیدھا راستہ دکھانے والی کتاب ہے، ہم اب بھی تم پر رحم فرمانے کے لیے تیار ہیں۔''

افسوس! یہود نے اس Mercy Appeal کا موقع بھی گنوا دیا، لیکن اس کے باوجود ''العذاب الاکبر'' کی Execution نہیں ہوئی۔ کیوں نہیں ہوئی؟ یہ اس داستان کا تلخ حصہ ہے۔ اس لیے کہ پہلے موجودہ مسلمان امت کے افضل حصہ (عالم عرب) کی پٹائی اس مغضوب اور ملعون قوم کے ہاتھوں کروانی ہے۔

امت مسلمہ کے عروج وزوال کی تاریخ

اب ہم اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں امت مسلمہ کی تاریخ کے مختلف ادوار کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس امت پر بھی بعینہٖ عروج وزوال کے وہی چار دور آ چکے ہیں جو تاریخ بنی اسرائیل کے حوالے سے بیان کئے گئے ہیں۔ امت مسلمہ کا پہلا دور عروج عربوں کی زیر قیادت آیا۔ اس پہلے دور میں خلافت راشدہ کا سنہری دور بھی شامل ہے۔ اس کے بعد خلافت راشدہ ختم ہوگئی مگر مسلمانوں کی حکومت موجود رہی۔ اس کے بعد پہلا دور زوال صلیبیوں کے ہاتھوں آیا۔ ۱۰۹۹ء میں یروشلم ہاتھ سے نکل گیا اور لاکھوں مسلمان قتل ہوئے۔ اس کے بعد ۱۲۵۸ء میں وہ فتنۂ تاتار آیا جس میں کروڑوں مسلمان قتل کر دیئے گئے، ان کی عظیم مملکت تہس نہس کر دی گئی......۱۲۵۸ء میں بغداد کا سقوط ہوا۔ بنو عباس کے آخری خلیفہ کو محل کے اندر سے گھسیٹ کر نکالا گیا اور جانور کی کھال میں لپیٹ کر گھوڑوں کے سموں تلے کچلوا دیا گیا۔ حضرت شیخ سعدیؒ نے مرثیہ کہا تھا: ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملک مستعصم امیر المؤمنین!

(امیر المؤمنین مستعصم کی سلطنت کے زوال پر آسمان کو حق ہے کہ وہ زمین پر (خون کے) آنسو برسائے)

دیکھئے دونوں امتوں کی تاریخ میں کتنی گہری مشابہت ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کاربن کاپی ہو۔ وہاں پہلے شمال سے آشوری آئے تھے، جب کہ یہاں پہلے یورپ یعنی شمال سے صلیبی آئے۔ وہاں مشرق سے کلدانی آئے تھے، جب کہ یہاں مشرق سے تاتاری آئے۔ وہاں لاکھوں انسانوں کا خون بہا، یہاں کروڑوں انسان تہ تیغ ہوئے (موجودہ امت مسلمہ کی وسعت کے لحاظ سے اس کے کروڑوں پرانی امت مسلمہ کے لاکھوں کے برابر ہی ہیں)

اس زوال کے بعد ہمارا دوسرا دور عروج شروع ہوا ؎

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

یعنی اللہ نے مسلمانوں کو جن کے ہاتھوں پٹوایا تھا انہی کے ہاتھ میں اپنے دین کا پرچم تھما دیا۔ یہ دوسرا عروج، سلطنت عثمانیہ کا دور ہے۔ چار سو برس تک خلافت کا یہ ادارہ قائم رہا۔ اسے گویا بنی اسرائیل کی مکابی سلطنت کا دور سمجھئے۔ پھر تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔

سابقہ امت مسلمہ پر بھی عذاب کا دوسرا مرحلہ یورپی اقوام کے ہاتھوں آیا تھا، موجودہ امت پر بھی یورپی سامراج (European Imperialism) کا تسلط ہوا۔ سابقہ امت مسلمہ پر پہلے یونانی حملہ آور ہوئے پھر رومی آئے، جب کہ ہم پر ولندیزی، انگریز اور اطالوی قوموں نے تسلط پالیا۔

جو چار ادوار سابقہ امت مسلمہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک مکمل ہوئے تھے وہ اس امت پر رواں صدی کے آغاز میں پورے ہو گئے۔ سابقہ امت مسلمہ کے لیے بھی کہہ دیا گیا تھا کہ ''وان عدتم عدنا'' (بنی اسرائیل:۸) (اگر تم باز نہیں آؤ گے تو ہم تم کو سزا پر سزا دیتے رہیں گے) چنانچہ ان کی سزا جاری رہی یہاں تک کہ صرف اسی صدی میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کو ہٹلر نے قتل کیا۔ انسانی تاریخ میں پہلے اس طرح کبھی نہیں ہوا کہ انسانی لاشوں کو تلف کرنے کے لیے پلانٹ بنائے گئے ہوں۔ ایک طرف سے لوگ Gas chamber میں داخل ہو رہے ہیں، کپڑے اتروا لیے گئے ہیں، ننگے داخل کئے جا رہے ہیں، مرتے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد پٹوں کے اوپر لاشیں جا رہی ہیں اور آگے جا کر مشینیں ان لاشوں کو چارے کی طرح کاٹ رہی ہیں...... بعد میں انہیں کیمیکل سے Treat کیا جا رہا ہے، اس لیے کہ اتنی لاشوں کو ٹھکانے (Dispose off) کیسے لگایا جائے۔ کون اتنی قبریں کھودے اور کون جلانے کی مصیبت اپنے سر لے۔ آخر میں ان پلانٹوں سے ایک سیاہ بدبودار مائع نکلتا تھا جس کو وہ اپنے کھیتوں میں کھاد کے طور پر پہنچا دیتے تھے! یہ سب اسی صدی کی بات ہے۔

آنے والے عذاب کی جھلک

اس ضمن میں جو تلخ ترین بات مجھے کہنی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی ''کاربن کاپی'' ابھی امت مسلمہ پر آنے والی ہے، اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث جھوٹی نہیں ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ اللہ نے ہم کو مغربی استعماریت سے نجات دلا دی ہے، لیکن ہم اب زیادہ بڑے امتحان میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ پہلے تو (بطور عذر) ہم کہہ سکتے تھے کہ ہم انگریزوں، فرانسیسیوں اور اطالویوں کے غلام ہیں، اب تو غلامی ختم ہو گئی ہے۔ لیکن غلامی کے خاتمے کے باوجود دنیا میں کوئی مسلمان ملک بھی ایسا نہیں ہے اس نظام کو قائم کر لیا ہو، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت و وراثت کی حیثیت سے ہمارے پاس ہے۔ لہٰذا امتحان میں اس ناکامی کا نتیجہ تو نکلنا ہی ہے۔

خروج دجال بھی سامنے کی بات ہے۔ یہودیوں کو ابھی عظیم تر اسرائیل قائم کرنا ہے۔ اس کے نقشے میں تقریباً آدھا جزیرہ نمائے عرب موجود ہے۔ مدینہ سمیت مصر کے پورے زرخیز علاقے پر ان کا دعویٰ ہے، عراق میں وہ اسیری میں رہے ہیں اس لیے اس پر بھی ان کا دعویٰ ہے اور شام تو ان کی ارض موعود ہے، ترکی کا مشرقی حصہ بھی ان کے نقشے میں شامل ہے۔ ایک طرف ان کے یہ عزائم ہیں اور دوسری طرف کوئی مزاحمت سرے سے موجود ہی نہیں۔ عالم عرب میں سے کس میں دم ہے؟ عراق کے کچھ ''ایٹمی دانت'' نکلنے کا اندیشہ ہو گیا تھا، لہٰذا اسرائیل نے سعودی عرب کی فضائی حدود سے گزر کر عراق کے ایٹمی ری ایکٹر تباہ کر دیئے اور جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ خلیج کی جنگ میں نکل گئی۔ امریکی فوجی جنرل شوازکوف نے صاف کہا ہے کہ ہم نے جنگ لڑی ہی اسرائیل کی حفاظت کے لیے ہے۔

نزول مسیحؑ اور خروج دجال

حدیث مبارکہ میں جس ''الملحمة العظمى'' (جنگ اعظم) کا ذکر ہے اس کے بارے میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ اتنے انسان قتل ہوں گے کہ ایک پرندہ اڑتا چلا جائے گا لیکن اسے سوائے لاشوں کے اور کچھ نظر نہیں آئے گا، یہاں تک کہ وہ تھک ہار کر گرے گا تو لاشوں پر ہی گرے گا۔

الملحمة العظمى، خروج دجال اور دجالی فتنہ سے مراد کیا ہے؟ ایک چیز دجالی فتنہ ہے، اس کا مفہوم کچھ اور ہے، اس فتنے میں تو ہم سب اس وقت مبتلا ہیں۔ ایک ''المسیح الدجال'' ہے۔ یہ درحقیقت ایک یہودی ہو گا۔ اس کا دعویٰ یہ ہو گا کہ ''میں مسیح ہوں۔'' یہ دعویٰ اس بنیاد پر کرے گا کہ یہود کے ہاں حضرت مسیحؑ کے بارے میں پیشین گوئیاں موجود تھیں۔ یہودی ان کو اپنا نجات دہندہ مانتے آ رہے تھے۔ وہ نجات دہندہ حضرت مسیحؑ ابن مریم تھے جن کی بعثت ہو بھی چکی، لیکن یہود نے ان کا انکار کر دیا بلکہ اپنی طرف سے تو گویا ان کو سولی پر ہی چڑھا دیا، لہٰذا ان کی جگہ یہود کے خیال میں اب بھی خالی ہے۔ اب کوئی شخص یہود میں سے عظیم تر اسرائیل قائم کرنے کا عزم مصمم لے کر اُٹھے گا۔ اس کے راستے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ صدام حسین کو تو امریکہ نے اس لیے رکھا ہوا ہے کہ اگر اسے ہٹایا گیا تو پھر ایران کو آگے بڑھنے سے روکنے والی کوئی طاقت نہ رہے گی۔ صدام حسین اگر اب تک کرسی اقتدار پر ہے تو کوئی اپنی طاقت سے تھوڑا ہی ہے، بلکہ اس کی اپنی تو کوئی حیثیت نہیں۔

اس طرح خود یہود میں سے خروج دجال ہو گا اور پھر ''خون اسرائیل'' نہیں خون اسمٰعیل جوش میں آئے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، جو اولاد اسمٰعیل میں سے ہیں، کی امت سے وہ عظیم قائد اٹھے گا جو مہدی کے نام سے مشہور ہے (اگرچہ مہدی اس کا نام نہیں صفت ہے)۔

میں نے دانستہ ''ظہور مہدی'' کے الفاظ کے بجائے ''عظیم قائد'' کا لفظ استعمال کیا ہے، تاکہ اہل تشیع کے امام غائب کے ظہور کی طرف اشارہ نہ سمجھا جائے۔ ہمارے نزدیک عالم عرب سے ایک قائد ابھرے گا، اس کی قیادت میں مسلمان صالحین وہ جنگ کریں گے کہ آسمان سے بھی مدد آئے گی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو گا اور یہ اصل عیسیٰؑ ہوں گے جو اس جعلی

مسیح کو مقام لد پر قتل کریں گے۔ یہی وہ مقام ہے جو اس وقت ''لڈا'' کے نام سے اسرائیل کا سب سے بڑا Air Base ہے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ ؑ صلیب توڑ دیں گے، گویا صلیب کا عقیدہ ختم کر دیں گے۔ وہ کہیں گی کہ مجھے تو کسی نے صلیب پر نہیں چڑھایا تھا، مجھے تو اللہ لے گیا تھا، اللہ ہی نے دوبارہ اتار دیا، تمہارا یہ عقیدۂ صلیب باطل ہے۔ اس کے علاوہ آپؑ خنزیر کو قتل کر دیں گے، گویا خنزیر کو حرام قرار دے دیں گے۔ پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہوگا، شریعت موسویؑ اور شریعت محمدیؐ مل کر دنیا پر چھا جائیں گے اور اس طرح پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہوگا۔

لیکن اس سے پہلے بہت بڑی سزا امت محمدؐ بالخصوص اس کے سب سے افضل حصے کو مل کر رہے گی۔ اس اصول پر کہ ؏

جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے

عربوں کا رتبہ بلند ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہی میں سے تھے۔ پھر اللہ کی آخری کتاب ان کی زبان میں نازل ہوئی۔ ہمیں قرآن سمجھنے کے لیے بڑی محنت کرنی ہوتی ہے، جب کہ عربی ان کی مادری زبان ہے۔

دنیا کے ایک ارب تیس کروڑ مسلمانوں میں سے ایک ارب کی تعداد میں غیر عرب ہیں جب کہ عربوں کی تعداد پچیس کروڑ سے زیادہ نہیں ہے۔ غیر عرب مسلمانوں میں سے چالیس کروڑ تو جنوبی ایشیا، برعظیم پاک و ہند میں رہتے ہیں۔ ان چالیس کروڑ میں سے دس کروڑ مسلمانان پاکستان ہیں، دس، گیارہ کروڑ بنگلہ دیش میں ہوں گے، جب کہ بھارت میں کم از کم اٹھارہ کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ عالم اسلام میں ثقافتی مراکز بھی دو ہی رہے ہیں۔ عربوں کے لیے ثقافتی مرکز مصر اور عجمی مسلمانوں کے لیے یہ برعظیم رہا ہے۔ ایک ہزار سال تک سارے مجددین عالم عرب میں پیدا ہوئے، جب کہ چار سو سال سے سارے مجددین برعظیم پاک و ہند میں پیدا ہوئے۔

اسلام کے نام پر تحریک اسی برصغیر میں چلی جس کا نتیجہ قیام پاکستان ہے۔ میں پاکستان کے بارے میں گومگو کی کیفیت میں ہوں۔ ایک اعتبار سے پوری امت مسلمہ میں عربوں کے بعد سب سے بڑے مجرم ہم ہیں۔ اس لیے کہ ان کے بعد فضل بھی سب سے زیادہ ہم پر ہی ہوا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں عظیم شخصیات یہیں سے ابھریں۔ علامہ اقبال جیسا مفکر یہاں پیدا ہوا، جس کے پائے کی شخصیت پورے عالم اسلام میں پیدا نہیں ہوئی۔ پوری دنیا میں صرف یہی ایک ملک ایسا ہے جو اس دور میں اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا۔ پاکستان کا قیام معجزے سے کم نہیں ہے۔ چند مہینے پہلے ج گاندھی یہ کہہ رہا تھا کہ پاکستان میری لاش پر ہی بن سکتا ہے، اسے پاکستان کو تسلیم کرنا پڑا۔ بہر حال پاکستان کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ

Hope for the best and be prepared for the worst

(امید بہترین کی رکھو لیکن بدترین (حالات) کے لیے تیار رہو)

پاکستان میں خلافت کا احیاء

تاہم ایک بات میں تیقن سے کہہ سکتا ہوں کہ خلافت کا احیاء شروع یہیں سے ہوگا۔ اس لیے کہ پوری اسلامی دنیا میں صرف اور صرف یہ ملک ایسا ہے جس میں قرارداد مقاصد منظور ہوئی اور دس کروڑ عوام کی اسمبلی نے اعلان کیا کہ ہم حاکمیت سے دستبردار ہوتے ہیں، حاکمیت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ ہمارے پاس جو بھی اختیارات ہیں وہ ایک امانت ہیں اور یہ انہی حدود کے اندر استعمال ہوں گے جو اصل حاکم نے مقرر کر دی ہیں۔ دنیا کے باقی تمام ممالک کے دساتیر میں زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ کسی ملک کے سرکاری مذہب کا نام اسلام لکھ دیا گیا ہے جو بہت محدود اور مبہم بات ہے۔

تبدیلی تو یہیں سے آئے گی لیکن اس تبدیلی کی عملی صورت یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ "Hope for the best" کے مصداق یعنی اللہ تعالیٰ ہمیں توبہ کی توفیق دے دے اور بغیر کسی مزید عذاب اور سزا کے ہم اللہ کی طرف لوٹ آئیں، اور یہ توبہ کرنے والے اتنی معتد بہ تعداد میں ہوں جو جمع ہو کر یہاں پر انقلاب برپا کر دیں، معدودے چند افراد کی توبہ سے ظاہر ہے کہ کام نہیں چلے گا۔ اگرچہ اس توبہ کا آغاز بہر حال افراد سے ہوگا کہ ؏

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

مگر کیا اجتماعی توبہ کی یہ توفیق ہم کو نصیب ہوگی؟ عذاب کا ایک کوڑا ہم پر پچیس سال پہلے برس چکا ہے، مگر ہم ایک بار پھر اس عذاب کے مستحق بن چکے ہیں۔ تاریخ سے ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ عذاب کا وہ کوڑا کوئی معمولی تو نہ تھا۔ بدترین شکست ہوئی، پاکستان دولخت ہوا، ۹۳ ہزار فوجی اور سویلین اس ہندو کی قید میں گئے جس پر ہم نے آٹھ سو برس تک حکومت کی تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہم کو مزید مہلت دی مگر افسوس! حالات اس طرح جا رہے ہیں کہ کہیں تاریخ پھر اپنے آپ کو نہ دہرائے۔ کسی قوم پر جب عذاب کے آثار شروع ہو جاتے ہیں تو پھر وہ ٹلا نہیں کرتا۔ پوری انسانی تاریخ میں اس کی واحد مثال حضرت یونس علیہ السلام کی قوم ہے، جس نے عذاب کے نمایاں آثار دیکھ کر اجتماعی توبہ کی اور اس کے نتیجے میں آتا ہوا عذاب ٹل گیا۔ یہی ایک راستہ مسلمانان پاکستان کے لیے بھی ہے کہ اجتماعی توبہ کرتے ہوئے اللہ کے ساتھ کئے گئے عہد و پیمان کو پورا کریں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اندیشہ ہے کہ کوئی پہلے سے بھی زبردست کوڑا ہماری پیٹھ پر برسے گا۔

تبدیلی کی دوسری عملی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ عذاب کے اس دوسرے کوڑے کے بعد ہم ہوش میں آ جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بڑا مبارک کوڑا ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (السجدہ:۲۱)

''ہم انہیں آخری بڑے عذاب سے قبل چھوٹے عذاب کا مزا چکھائیں گے شاید کہ وہ لوٹ آئیں۔''

اسی چھوٹے عذاب کا ایک کوڑا ہم پر پڑا تھا، لیکن دو ہزار میل دور ہونے کی وجہ سے ہم نے محسوس ہی نہیں کیا۔ کتنے لوگ مرے، کتنی عصمتیں لٹیں اور کتنے گھر اجڑ گئے، اس کا ہمیں اندازہ ہی نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ڈھائی تین لاکھ پاکستانی ابھی تک وہیں پڑے ہیں اور جانوروں سے بدتر حالت میں ایک ایک کوٹھڑی میں پندرہ پندرہ انسان رہ رہے ہیں! مگر ہم بہر حال مکمل تباہی سے بچ گئے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے تازہ مہلت عمل (Fresh lease of existance) عطا کر دی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نکسن کا دل موڑ دیا، اس نے Hot line پر بھارت کو Ultimatum دے ڈالا، کوسیجن نے بھی اندرا گاندھی کو حکم جاری کر دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خصوصی مداخلت نہ ہوتی تو پھر جو تباہی آنی تھی اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا Morale آسمان پر تھا جب کہ ہمارا پاتال میں۔ ہماری فضائیہ مفلوج ہو چکی تھی، ہمارے جہاز تو حرکت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ روس کے دیئے ہوئے اواکس طیارے بھارت کو پاکستان میں اڑنے والی چڑیا کی بھی خبر کر دیتے تھے۔ وہ ہماری بحریہ کو کیماڑی میں مار کر چلے گئے تھے۔ ہمارا Land defence ٹوٹ چکا تھا سوائے ہیڈ سلیمانکی کے۔ شکر گڑھ اور راجستھان میں ہمارا محاذ ٹوٹ چکا تھا۔ ان حالات میں امریکہ اور روس کے صدور کی مداخلت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلوں کو پھیرنے کی قوت کا ظہور اور مغربی پاکستان کا بچ جانا اللہ کی مشیت کا مظہر ہے۔

بھارت میں ہندومت کا احیاء

پاکستان کی تبدیلی کے حوالے سے تیسری اور آخری بات بہت بھاری دل کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ بھارت میں ہندومت کا احیاء بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ ایودھیا کی مسجد گرانے کے لیے بھارت کے کونے کونے سے جو تین لاکھ کارکن پہنچے ہیں، ان کے ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان کے کونے کونے سے آئے مگر مسلمانوں کو کہیں بھی گزند نہ پہنچایا۔ یہ کام ڈسپلن کے بغیر ممکن نہیں۔ نرے ہجوم کو قابو میں نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ اعلیٰ تربیت یافتہ اور منظم کارکن تھے۔ ان کا بس ایک ہی مقصد تھا، بابری مسجد کو منہدم کرنا۔ وہ گرائی اور واپس آ گئے۔ فسادات جو ہوئے وہ بعد میں ہوئے، جب مسلمانوں نے احتجاجی تحریک چلائی۔

میں یہ حقائق چھ سال کے عرصے سے بتا رہا ہوں کہ آر ایس ایس میں ۲۵ لاکھ کارکن موجود ہیں۔ ان سب کا مقصد اسلام اور پاکستان کا خاتمہ ہے۔ حال ہی میں ان کے تیسرے گرو ''دیوداس'' نے ہندوستان کی تمام ہندو سماجی، علمی، سیاسی اور غیر سیاسی تنظیموں کو ایک سرکلر بھیجا ہے۔ اس میں اس نے کہا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ہندوستان کی زمین کو مسلمانوں کی نجاست سے پاک کر دیں۔ اس گرو نے مزید لکھا کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر کچھ ردعمل ہوگا تو وہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں ہوگا جس کی ہمیں پرواہ کی ضرورت نہیں ہے، باقی پورے عالم اسلام میں کہیں ردعمل نہیں ہوگا۔ اس نے یہ الفاظ استعمال کیوں کئے ہیں کہ ''میں تم کو یقین دلاتا ہوں؟............ اس لیے کہ ایودھیا کی مسجد کی تہدیم پر پورے عالم اسلام میں ان دو ممالک...... پاکستان اور بنگلہ دیش...... کے علاوہ کہیں ردعمل نہیں ہوا۔ کسی مسلمان ملک نے یہ تک نہیں کہا کہ مسجد دوبارہ تعمیر کرو ورنہ ہمارے تمہارے ساتھ تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ سفارتی تعلقات توڑنا تو دور کی بات ہے، اگر صرف امارات، سعودی عرب اور کویت کی یہ دھمکی آ جاتی کہ ہم تجارتی تعلق منقطع کر رہے ہیں تو بھارت کے ہوش ٹھکانے آ جاتے۔

یہ ہے تیسری صورت جو بدترین ہوگی۔

ایک طرف تو ہندومت کا تیزی سے احیاء ہو رہا ہے اور دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ ہم بدترین انتشار کا شکار ہیں۔ الیکشن [19] میں دینی، مذہبی اور سیاسی جماعتوں کا جو حشر ہوا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ لیکن کوئی پتہ نہیں کہ تاریخ ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو دہرا دے کہ ہندو قوم کے ہاتھوں ہم کو تہس نہس کرا دیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کو اسلام لانے کی توفیق عطا کر دے۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

نظام خلافت کب اور کہاں برپا ہوگا؟

بہرحال ان تین صورتوں میں سے خواہ کوئی بھی پیش آئے مجھے یقین ہے کہ ان شاء اللہ خلافت کا احیاء اسی خطے سے ہوگا۔ایک سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے کہ یہ احیاء کب ہو گا؟ میں کیا جواب دوں گا، جب کہ قرآن نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوا دیا:

﴿اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ﴾ (الانبیاء:۱۰۹)

''میں نہیں جانتا کہ (جس بات کی تمہیں خبر دی جارہی ہے) جو وعدہ تم سے کیا جارہا ہے وہ قریب ہے یا دور۔''

اسی طرح سورۂ جن میں آیا ہے:

﴿قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا﴾ (الجن:۲۵)

یعنی ''مجھے معلوم نہیں ہے کہ (جو خبر تم کو دی جارہی ہے) جو وعدہ تم سے کیا جارہا ہے وہ قریب آچکا ہے یا ابھی اس میں تمہارا رب کوئی تاخیر کرے گا۔''

اسی خطے سے نظامِ خلافت کے احیاء کا یقین مجھے بہرحال حاصل ہے۔اب میں اس کی تائید میں دو حدیثیں پیش کر رہا ہوں۔ایک حدیث ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے:

''مشرق سے فوجیں نکلیں گی جو مہدی کی حکومت قائم کرنے کے لیے منزل پر منزل مارتی چلی آئیں گی۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مشرق کے کسی علاقے میں وہ نظام خلافت پہلے قائم ہو چکا ہوگا۔دوسری حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور اس کو امام ترمذیؒ نے اپنی ''جامع'' میں روایت کیا ہے:

''خراسان کی جانب سے علم چلیں گے، ان کو کوئی روک نہ سکے گا جب تک کہ وہ ایلیاء میں جا کر نصب نہ ہو جائیں۔''

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یروشلم کا نام ایلیاء تھا) خراسان اس علاقے کا نام ہے جس کا کچھ حصہ اس وقت پاکستان میں ہے اور زیادہ حصہ افغانستان میں ہے۔گویا یہی علاقے ہیں جہاں سے خلافت کا آغاز ہوگا۔

بظاہر بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، کیونکہ عربوں کے بعد سب سے بڑی مجرم قوم ہم مسلمانان پاکستان ہیں۔اس وقت پاکستان ننگے سیکولرازم کی طرف جارہا ہے، حتیٰ کہ قومی شناختی کارڈ پر مذہب کا خانہ تک درج نہ ہوسکا۔اس لیے کہ یہ بات عیسائیوں کو پسند نہ تھی، یہاں تک کہ مذہب کا خانہ ختم کرانے کے لیے پوپ صاحب بھی بول پڑے۔یہ سب اس ملک میں ہورہا ہے جو اسلام ہی کی نام پر معرض وجود میں آیا تھا۔

جیسا کہ اس سے پہلے واضح کر چکا ہوں کہ کتب احادیث میں ''کتاب الفتن و کتاب الملاحم'' سے مراد جنگوں کا باب ہے۔ان میں خاص طور پر ''الملحمة العظمٰی'' کا ذکر ملتا ہے جو تاریخ انسانی کی عظیم ترین جنگ ہوگی۔اس کے علاوہ احادیث میں علاماتِ قیامت، خروجِ دجال، عرب میں قیادت مہدی کا ظہور، مشرق سے فوجوں کی آمد، آسمان سے حضرت مسیحؑ کا نزول، اس کے نتیجے میں یہود کا استیصال اور پھر عالمی سطح پر اسلام کے نظام خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔میں نے اس سے پہلے بھی کہا ہے کہ یہ وہ حالات ہیں جو میرے اندازے میں تو زیادہ دور نہیں ہیں، قرائن وشواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ بہت قریب پہنچ چکا ہے۔

ذات باری تعالیٰ کو کس نے دیکھا ہے، بس اس کی آیات ہی سے تو اسے پہچانا جاتا ہے۔

حق مری دسترس سے باہر ہے
حق کے آثار دیکھتا ہوں میں!

اسی طرح جو پیش آنے والے حالات ہیں اور قیامت سے قبل کی جو علامات ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وضاحت سے بیان فرما دیا ہے۔چنانچہ دیکھنے والے ان کو دیکھ رہے ہیں۔محسوس ہوتا ہے جیسے بساط بچھ رہی ہے، جیسے کسی ڈرامے کے لیے سٹیج تیار کیا جاتا ہے اور سامان فراہم کیا جاتا ہے۔

جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ درحقیقت دو مسلمان امتوں کی سزاؤں کی آخری قسطیں ہیں جو کہ اب آنے والی ہیں۔

حادثات اور واقعات کا ظاہر و باطن

ایک اصولی بات اور سمجھ لی جائے کہ تاریخ میں جو بڑے بڑے حادثات و واقعات رونما ہوتے ہیں ان کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ ظاہر میں کون کون سی قوتیں اور عوامل کار فرما ہیں، باطن میں اصل حقیقت کیا ہے اور مشیت ایزدی کس طور سے اپنا ظہور کر رہی ہے، یہ دو چیزیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ بسا اوقات ظاہری اعتبار سے جن چیزوں کی، جن واقعات و حادثات کی بہت اہمیت ہوتی ہے، باطنی اعتبار سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اسی طرح باطنی اعتبار سے جن امور کی اہمیت ہوتی ہے وہ ظاہری اعتبار سے اہمیت کے حامل نظر نہیں آتے۔ اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ جن حالات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ہے اس وقت کی دنیا نے اس واقعہ کی اہمیت کو کیا سمجھا ہوگا؟ دنیا کے ایک چھوٹے سے کونے میں، جزیرہ نمائے عرب کے لق و دق صحرا میں ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا، پھر اس واقعہ نے آگے چل کر وہاں انقلاب برپا کر دیا۔ مگر دنیا پر اس کا یا اس کے نتیجہ میں برپا ہونے والے انقلاب کا فوری اثر کیا ہوا ہوگا؟ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی دنیا میں آباد انسانوں کی اکثریت نے اس کا کیا نوٹس لیا ہوگا؟ لیکن معنوی اعتبار سے یہ کتنا اہم وقعہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انبیاء و رسل کے سلسلہ کا خاتمہ اور تکمیل ہے۔ اس بعثت کی وجہ سے روئے ارضی پر کتنا بڑا انقلاب برپا ہوا؟ اگرچہ اس وقت کے حالات و واقعات میں کچھ دوسری قوتیں زیادہ مؤثر نظر آتی ہیں۔ حقیقت میں باطنی معاملہ تو ''مشیت ایزدی'' کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جو قانون ہے، اس کی جو سنت ہے۔ یہ واقعہ اس کا ظہور ہے اور جیسا کہ اس سے قبل کہا گیا مسلمان امتوں پر بھی عذاب آتا ہے اور کافروں سے بڑھ کر عذاب آتا ہے۔ مگر کفار کے ضمن میں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ وہ کافر جن کی طرف براہ راست کوئی رسول آیا ہو، اور رسول کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود وہ ایمان نہ لائیں تو ایسے کافروں کو کوئی رعایت نہیں ملتی، لیکن ان کے علاوہ وہ کفار جن پر کسی رسول نے براہ راست حجت پوری نہیں کی تو ان پر دنیا میں کوئی عذاب نہیں آتا، ان کا سارا معاملہ آخرت میں ہی چکایا جائے گا۔ اس دنیا میں سزا رسولوں کی امتوں کو ان کے اعمال اور قول و فعل کے تضاد کی بنیاد پر ملتی ہے۔ سورۂ صف کی آیت ۲ میں ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ○ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ○﴾

''اے اہل ایمان! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ ناراضی کے لحاظ سے اللہ کے نزدیک یہ بات بہت بڑی ہے کہ وہ کہو جو کرتے نہیں ہو۔''

اس بات کا تجزیہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ ایک قوم مدعی ہے کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں، اس کے رسول کو مانتے ہیں، اس کی کتاب کو مانتے ہیں اور اس کی شریعت کو مانتے ہیں، مگر یہ سب کچھ ماننے کے بعد عمل نہیں کرتے یا عمل کرتے ہیں تو جزوی طور[20] پر۔ اپنے اس طرز عمل کی وجہ سے وہ مسلمان امت جو زمین پر اللہ کی نمائندگی کے منصب پر فائز تھی اس نے الٹی نمائندگی شروع کر دی ہے تو یہ امت اب خالق اور مخلوق کے درمیان حجاب بن گئی ہے۔ دنیا ان کو دیکھتی ہے اور انہی کے حوالے سے دین کو سمجھتی ہے۔ اس وقت یہ امت مخلوق خدا کو دین کی طرف لانے کے بجائے اس سے لوگوں کو متنفر کر رہی ہے۔

اپنے اس طرز عمل اور غلط نمائندگی کے باعث یہ کافروں سے بڑھ کر مجرم اور زیادہ شدید سزا کی مستحق بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پٹائی ایک مغضوب اور ملعون قوم[21] کے ہاتھوں ہو رہی ہے اور مزید ہوگی۔

یہود کے خواب اور ان کی تعبیر

یہود کے عزائم کو میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ ہمارے ایک ساتھی نے، جو پی آئی اے میں کام کرتے ہیں، ایک چونکا دینے والی بات بتائی۔ پچھلے دنوں وہ اپنی فلائٹ پر بنکاک گئے ہوئے تھے۔ وہاں ٹیلی ویژن پر ایک فلم "Stories of the Bible" دکھائی جا رہی تھی۔ اس فلم میں تاریخی دلائل و شواہد اور اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے ذریعے یہودی یہ پرچار کر رہے ہیں کہ ان کا ''تابوت سکینہ''[22] مسجد اقصیٰ کے نیچے ایک سرنگ میں موجود ہے۔ جب بخت نصر نے ہیکل سلیمانی منہدم کیا تھا، یہود کے دعویٰ کے مطابق وہ اسی وقت سے یہاں دفن ہے۔ اسی لیے یہود اسے دوبارہ نکالنے کی کوشش بھی کر چکے ہیں، اس میں تو وہ ناکام رہے مگر اب بڑی تیزی سے اس طرف جا رہے ہیں کہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر اور ''تابوت سکینہ'' کی تلاش میں مسجد اقصیٰ کو منہدم کیا جائے۔ اسرائیل کی سپریم کورٹ فیصلہ دے چکی ہے کہ ''یروشلم'' اسرائیل کا ''اٹوٹ انگ'' ہے۔

حالات اب روز روشن کی طرح واضح ہو رہے ہیں۔ جو لوگ احادیث صحیحہ سے استغناء برتتے ہیں ان کی حالت پر مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ اب تو حقائق حدیث مبارکہ کی تشبیہ[23] ''مثل فلق الصبح'' صبح صادق کی طرح کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔

یہود کی جو سزا مؤخر تھی اس کی تنفیذ کا وقت بھی قریب آ چکا ہے۔ میں ان حقائق کو حکمت قرآن کی بنیاد پر مانتا ہوں۔ احادیث ان کی تائید کرتی نظر آتی ہیں۔ علاوہ ازیں عقل و منطق بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے۔ آپ غور کریں کہ یہود کو کون ختم کر سکتا ہے؟ اسرائیل کے پاس کتنے ایٹم بم موجود ہیں؟ مسلمان ممالک میں سے کسی کے پاس ایک بھی نہیں۔ دنیا کو

کچھ پاکستان پر شک ہونے لگا ہے کہ اس کے پاس ''اسلامک بم'' ہے۔ امریکی سینیٹر ز بھی آ کر کہہ گئے ہیں کہ ہمیں ''اسلامک بم'' سے بہت خوف آتا ہے۔ لہٰذا اسرائیل اور یہود کو تو وہی آخری درجے کے معجزے ختم کر سکتے ہیں جو حضرت مسیحؑ کو دیئے گئے ہیں۔ اس لیے حدیث میں آیا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی نگاہ جہاں تک جائے گی یہودی پگھلتے چلے جائیں گے۔ یہ الفاظ بھی حدیث میں ہیں کہ اگر کوئی یہودی کسی پتھر کے پیچھے چھپے گا تو وہ پتھر بھی پکارے گا کہ ''اے روح اللہ! یہ میرے پیچھے ایک یہودی چھپا ہوا ہے'' تو گویا ایک دفعہ ''گریٹر اسرائیل'' قائم ضرور ہوگا، مگر پھر وہی ان کا ''Greater Graveyard'' بھی بنے گا۔

یہ بات بھی عقل و منطق کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ یہود کا ''دورِ انتشار'' جو ۷۰ء سے شروع ہوا ہے، جس کے بعد یہود پوری دنیا میں در بدر ہو گئے تھے، جہاں جس کے سینگ سمائے چلا گیا، لیکن مختلف ممالک میں پہنچ کر انہوں نے اپنے اڈے بنا لیے اور جم کر بیٹھ گئے۔ اب یہود کو ختم کرنے کے لیے یا تو پوری دنیا پر عذاب لایا جائے یا ان سب کو کہیں سمیٹ کر ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ یہی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اسرائیل کے قیام کے بعد سے انہیں بظاہر مسلسل فتوحات حاصل ہو رہی ہیں۔ ان کے ہاتھوں عرب مسلمان پٹ رہے ہیں۔ لیکن درحقیقت مشیت ایزدی اس طرح تمام کوڑے کرکٹ کو جھاڑ و دے کر ایک جگہ جمع کر رہی ہے، تاکہ سب کو ایک ساتھ دیا سلائی دکھائی جا سکے۔ یہ بات سورۂ بنی اسرائیل میں موجود ہے۔ پہلے رکوع میں تاریخ بنی اسرائیل کے چار ادوار کا ذکر ہے، جب کہ آخری رکوع میں فرمایا:

﴿فَإِذَا جَآءَ وَعۡدُ ٱلۡأٓخِرَةِ جِئۡنَا بِكُمۡ لَفِيفٗا ۝﴾

''جب آخرت والے وعدے کا وقت آئے گا تو ہم تم سب (یہود) کو لپیٹ کر لے آئیں گے۔''

دیکھ لیجئے! پوری دنیا سے یہودی اسرائیل کا رخ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سب کے سب موجودہ اسرائیل میں تو نہیں سما سکتے، لہٰذا ''گریٹر اسرائیل'' وجود میں لایا جائے گا۔

ان تمام حقائق کے بارے میں اب کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے، لیکن عہد حاضر میں احادیث نبویہؐ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو استغناء برت رہا ہے، وہ فتنۂ انکار سنت اور فتنۂ قادیانیت کا نتیجہ ہے۔ اسے ہم ''اعتزال جدید'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ روزنامہ ''نوائے وقت'' میں جب میرے مضامین شائع ہو رہے تھے تو ان کے حوالے سے ایک لمبا چوڑا خط میرے پاس امریکہ سے آیا۔ خط میں کہا گیا تھا کہ آپ پیشین گوئیوں کی باتیں کر رہے ہیں!! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مسلمان ان کے انتظار میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھے رہیں؟ ان صاحب سے جب خط وکتابت کا سلسلہ چلا تو معلوم ہوا کہ وہ قادیانی ہیں۔ میں نے انہیں جواباً لکھا کہ پیشین گوئیاں صرف احادیث میں نہیں قرآن میں بھی تو ہیں۔ سورۂ روم کی ابتدائی آیات پیشین گوئی پر مبنی نہیں؟ اس پیشین گوئی میں کہا گیا ہے کہ اگرچہ اس وقت رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں، لیکن چند سال کے اندر اندر وہ دوبارہ غالب آ جائیں گے اور اس دن مومن بھی اللہ کی دی ہوئی فتح پر خوش ہوں گے۔ یہ پیشین گوئی نو سال میں پوری ہو گئی۔ ایک طرف ہرقل نے یروشلم دوبارہ فتح کر لیا اور ایرانیوں کو شکست فاش دی۔ دوسری طرف بدر میں مسلمانوں کو اللہ نے فتح عظیم اور یوم فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والا دن) عطا فرمایا۔ یہ پیشین گوئی نو سال بعد حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ کیا نو سال تک مسلمان ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ گئے تھے اور پیشین گوئی پوری ہونے کا انتظار کرتے رہے تھے؟ نہیں! اس کے برعکس ہوا یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ماریں کھائیں، ہجرت کی، اہل وعیال کو انسان نما بھیڑیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر مدینہ کا رخ کیا اور پھر تین سو تیرہ...... پندرہ سال کی محنت شاقہ کا حاصل...... آپؐ نے میدان میں لا کر ڈال دیے، تب فتح مبین حاصل ہوئی۔

اب بھی جو کچھ ہوگا محنت و کوشش سے ہوگا۔ جن کو توفیق ملے گی وہ اس کام میں لگ جائیں گے۔ چنانچہ قرآن کی پیشین گوئیوں کی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پیشین گوئیاں فرمائی ہیں، مگر نہ قرآنی پیشین گوئیوں کا مطلب ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانا تھا اور نہ احادیث میں وارد پیشین گوئیوں کا یہ مطلب ہے۔

حواشی

۱. اس موقعہ پر یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ حضرت طالوتؓ سے لے کر حضرت سلیمانؑ تک کا دور جو تقریباً ایک سو برس پر محیط ہے، سابقہ امت مسلمہ کی خلافت راشدہ کا دور ہے۔

۲. اس سابقہ امت کا وجود تو کسی مصلحت کے تحت (جس کی وضاحت آگے کر دی گئی ہے) اب تک برقرار رکھا گیا ہے، تاہم وہ اپنے منصب سے معزول ہو چکی ہے۔

۳. ہمارے ہاں کچھ لوگ ''خلفائے ثلاثہ'' کی خلافت کے ہی نہیں ان کے اعمال صالحہ کے بھی منکر ہیں مگر سورۂ نور کی یہ آیت ان کے ان سارے دعوؤں کی کامل نفی کرتی ہے۔ چنانچہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء'' میں جن آیات پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے ان میں سے پہلی آیت یہی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے استدلال کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنے پختہ وعدے موجود ہیں تو ان وعدوں کا مصداق آخر خارج میں بھی تو ہوگا اور اگر ''خلافت راشدہ'' کے دور کو خلافت کا دور اور آیت کا مصداق مان لیا جائے تو قرآن مجید کی شہادت کے مطابق پہلے تین خلفاء بھی ایمان و عمل صالح کا حق ادا کرنے والے ٹھہرتے ہیں، گویا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایمان اور عمل صالح کے مصداق کامل ٹھہرتے ہیں۔ جبھی تو ''خلافت'' کے حقدار

ہوئے۔''

یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہوا ہے۔ ورنہ یہ لوگ اس آیت کو قرآن حکیم سے اب تک اس طرح کھرچ چکے ہوتے کہ اس کے وجود کا سراغ تک نہ ملتا۔

۴ چاہے۔ خواہ

۵ مولانا ظفر علی خان مرحوم نے اس آیت کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا ہے:

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

۶ اسی مضمون کی آیت سورۂ توبہ میں بھی معمولی فرق کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔

﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ○﴾ ترجمہ: ''چاہتے ہیں کہ بجھا دیں روشنی اللہ کی اپنے منہ سے اور اللہ نہ رہے گا بدون پورا کئے اپنی روشنی کو اور پڑے برا مانیں کافر۔'' اس آیت میں بھی تذکرہ یہود ہی کا ہے۔

۷ یہ اہم نکتہ ہے کہ قرآن مجید صلح حدیبیہ کو فتح مبین قرار دیتا ہے، لیکن فتح مکہ کا ذکر اس اہتمام سے نہیں کرتا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ صلح حدیبیہ میں کفار نے مسلمانوں کے وجود کو ایک طاقت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تھا اور یہ سب سے بڑی کامیابی تھی۔ ہمارے زمانے میں عربوں کے مقابلے میں یہود نے ۱۹۴۸ء میں زبردست کامیابی حاصل کی، پھر ۶۷ء میں یہود نے عربوں کے بڑے بڑے علاقوں پر قبضہ کر لیا اور ان کی طاقتور ترین حکومتوں مصر اور شام کو شکست سے دوچار کیا، لیکن اسرائیل کی اصل اور سب سے بڑی فتح یہ ہے کہ آج تمام عرب ممالک اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ توہین و تذلیل کی حد ہے کہ سب کو اسرائیل کے سامنے ایک میز پر گفتگو کے لیے بلا لیا گیا ہے۔ حالانکہ عرب اس پر کبھی تیار نہ تھے صرف مصر نے یہ ذلت گوارا کی تھی، لیکن اب سب کو میڈرڈ میں بلا کر بٹھایا گیا ہے۔ یہ میڈرڈ ''تہذیب حجازی'' کے مزار اندلس (اسپین) کا معروف شہر ہے۔ اس سے قبل میڈرڈ میں کوئی بین الاقوامی کانفرنس منعقد نہیں ہوئی، لیکن عربوں کی تذلیل کے لیے یہ جگہ منتخب کی گئی ہے، جہاں پر آٹھ سو سال انہوں نے حکومت کی تھی، مگر جہاں سے ان کا بچہ بچہ ختم کیا گیا اور جہاں سے ان کو ذلیل کر کے نکالا گیا تھا۔

۸ ۱۹۹۴ء تک۔

۹ یعنی میں تمہارے درمیان بنفس نفیس موجود رہوں گا پھر ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ (المومن: ۳۰) (موت تم کو بھی آتی ہے اور موت ان کو بھی آنی ہے) کے تحت اللہ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخت سفر باندھ لیں گے۔

۱۰ واضح رہے کہ یورپ دو صلیبی جنگیں پہلے لڑ چکا ہے۔

۱۱ اس موقع پر ایک نہایت عبرت انگیز اور سبق آموز واقعہ اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ہے۔ دوران اسیری انگریز کمانڈنٹ آپ کی درویشی سے متأثر ہو گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ آپ لوگ ہماری خلافت کے پیچھے کیوں پڑے ہو؟ یہ تو ایک مردہ خلافت ہے، اس سے آپ کو کیا تکلیف ہے؟ اس نے جواب دیا ''مولانا آپ اتنے سادہ نہ بنئے! آپ بھی جانتے ہیں اور ہم کو بھی معلوم ہے کہ یہ گئی گزری خلافت بھی اتنی طاقتور ہے کہ اگر کہیں دارالخلافہ سے جہاد کا اعلان ہو جائے تو مشرق سے مغرب تک لاکھوں مسلمان سر سے کفن باندھ کر میدان میں نکل آئیں گے۔''

۱۲ منطق میں دو معلوم یا تسلیم شدہ باتوں یا قضیوں کو ترتیب دے کر کسی نامعلوم بات جسے نتیجہ کہتے ہیں، تک پہنچنے کو قیاس کہتے ہیں۔ معلوم قضیوں کا Subject موضوع کہلاتا ہے۔ جس قضیہ کا موضوع زیادہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے وہ قضیہ ''کبریٰ'' کہلاتا ہے اور جس کا موضوع نسبتاً کم افراد پر مشتمل ہوتا ہے اس قضیہ یا مقدمے کو ''صغریٰ'' کہتے ہیں۔ دو قضیوں میں جو مشترک بات ہوتی ہے اسے ''حد اوسط'' کہتے ہیں۔ صغریٰ اور کبریٰ میں سے حد اوسط نکال دینے سے نتیجہ سامنے آ جاتا ہے۔ مثلاً کرکٹ کھیل ہے (صغریٰ) کھیل تفریح ہے (کبریٰ) نتیجہ: کرکٹ تفریح ہے۔ حد اوسط: ''کھیل'' کو دونوں جملوں سے خارج کر کے نتیجہ معلوم کر لیا گیا۔

۱۳ ان تین نسبتوں میں سے ''خلیل اللہ'' کی نسبت بہت اہم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرمایا تھا ((لو كنتُ متخذاً خليلا لاتخذتُ ابابكرٍ خليلاً)) ''اگر میں کسی کو اپنا خلیل بناتا (یعنی انسانوں میں سے) تو ابوبکر کو خلیل بناتا۔

اس حدیث سے دو عظیم حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ انبیاء کے علاوہ انسانوں میں سے عظیم ترین انسان ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ دوسری یہ کہ وہ بھی اس مقام پر نہیں کہ جس کو خلیل کہا جا سکے۔ ''خلیل'' وہ لفظ ہے جو اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ فرمایا: وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا (النساء: ۱۲۵) یعنی ''اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو خلیل بنا لیا۔''

۱۴۔ جہاں جہاں تم کورنگ و بو کی ایسی دنیا نظر آتی ہے جس کی خاک سے آرزو کا پودا پھوٹتا ہے، اس دنیا کی رونق یا تو مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے ہے۔ یا وہ دنیا ہنوز مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں ہے۔

۱۵۔ اس ''انجمن اقوام'' کے بارے میں اقبال نے تبصرہ کیا تھا:

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے و لیکن
پیران کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے!

۱۶۔ (i) صہیونی اکابر تینتیسویں مرتبہ پر فائز یہودی دانشوران کے کئی خفیہ اجلاس ۱۸۹۷ء سے منعقد ہونا شروع ہوئے۔

(ii) صہیونی اکابر کے خفیہ اجلاس میں ساری دنیا پر یہودی حکومت قائم کرنے کے لیے جو خفیہ دستاویز تیار کی گئی تھی وہ ''پروٹوکول'' کے مختصر نام سے معروف ہے، اس کا پورا نام The Protocol of the learned zions ہے۔ اس دستاویز میں ۲۴ دفعات ہیں۔ اس خفیہ دستاویز کو پہلے دو روسی اخباروں نے شائع کیا، پھر عیسائی پادریوں نے ۱۹۰۵ء میں اس یہودی سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے شائع کیا۔ اس کا نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہود اس دستاویز کو عام نہیں ہونے دینا چاہتے اور جہاں بھی اس کے نسخے ملتے ہیں انہیں ضائع کرنے کے درپے رہتے ہیں، تاکہ غیر یہود ان کی سازشوں سے بے خبر رہیں۔

۱۷۔ جنگ عظیم اوّل میں برطانوی وزیر خارجہ، جس نے جنگ میں یہودی امداد کے معاوضہ میں فلسطین میں جنگ کے بعد یہودی حکومت (اسرائیل) کے قیام کا اعلان کیا تھا۔

۱۸۔ قرآن حکیم کی ایک آیت سے بھی اشارہ نکلتا ہے کہ دونوں...... حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام...... کے درمیان کوئی دوسرا نبی نہیں تھا۔ آل فرعون میں سے ایک مؤمن کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿حَتّٰٓی اِذَا ھَلَکَ قُلْتُمْ لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰہُ مِنْۢ بَعْدِہٖ رَسُوْلًا﴾ (غافر:۳۴) ''یہاں تک کہ جب وہ (حضرت یوسفؑ) وفات پا گئے تو تم یہ کہنے لگے اب ان کے بعد اللہ کوئی اور رسول نہیں اٹھائے گا۔''

۱۹۔ واضح رہے کہ یہ خطاب ۱۹۹۳ء کا ہے اور ''تازہ الیکشن'' سے مراد ۱۹۹۳ء کے انتخاب ہیں۔

۲۰۔ ہماری جہالت اور بدبختی لائق ماتم ہے کہ ہم نے اپنی بے عملی، بدعملی یا دورنگی کے جواز کے لیے خوب خوب عذر تراش رکھے ہیں۔ چنانچہ ہم بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ اگر ہم بد ہیں تو کیا ہوا، ہیں تو امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں۔ ہم اللہ اور رسول ﷺ کو مانتے ہیں...... نہ ماننے والوں سے تو اچھے ہیں۔ ہم بڑی عقیدت کے مظاہرے کے ساتھ کہتے ہیں: ''ہم تیرے محبوبؐ کے امتی ہیں'' اور پھر اگر ہم کچھ احکام پر عمل کر لیتے ہیں تو ان کے مقابلے میں تو بہتر ہی ہیں جو کسی حکم کو نہیں مانتے۔ آخر کچھ تو ہمارا کریڈٹ ہونا چاہئے۔

یہ ہے ہماری سوچ کا انداز، مگر قرآن حکیم ہمیں دوسرا ہی فیصلہ سناتا ہے۔ یہود کی روش یہ تھی کہ مختلف یہودی قبائل اپنے اپنے حلیف غیر یہودی قبائل کے ساتھ مل کر دیگر یہودی قبائل سے جنگ کرتے اور ان کو گھروں سے نکال کر قیدی بناتے۔ مگر جب وہ گرفتار ہو کر آتے تو ان کو یاد آجاتا کہ یہ تو ہمارے یہودی بھائی ہیں، ان کو ہم گرفتار کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ یہودیوں کا فدیہ ادا کر کے ان کو رہائی دلاتے اور فدیہ ادا کرنے کے لیے چندے جمع کرتے۔ یہود کی اس روش پر تنقید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ (البقرہ:۸۵) ''تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے کے منکر ہو۔'' پھر اس روش کی سزا کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: ''تم میں سے جو شخص یہ طریقہ اختیار کرتا ہے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں وہ رسوا ہو اور آخرت میں اس کو سخت عذاب میں ڈالا جائے۔'' یہ اللہ کا ابدی قانون ہے، اس میں کسی کے ساتھ رورعایت نہیں کی جاتی ہے۔

۲۱۔ امیر جماعت اسلامی کراچی چوہدری غلام محمد مرحوم اس معاملے کو ''چمار کے ہاتھوں پٹوانا'' کہا کرتے تھے۔

۲۲۔ یہود کے تابوت سکینہ کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ یہ تابوت جو یہود کے دشمنوں کے پاس چلا گیا تھا اس کی واپسی کو ''طالوت'' کی سرداری کی علامت کے طور پر یہاں بیان کیا گیا ہے۔ اس ''تابوت سکینہ'' میں کہا جاتا ہے کہ وہ الواح موجود ہیں جن پر تورات لکھی ہوئی حضرت موسیٰؑ کو عطا کی گئی تھی۔ اس کے اندر حضرت موسیٰؑ کے عصا کی موجودگی کا دعویٰ بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہود اس ''تابوت سکینہ'' کو بہت مقدس جانتے ہیں اور اس کو اپنی فتح کی علامت تصور کرتے ہیں۔

۲۳۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر آغاز وحی رویائے صادقہ سے ہوا۔ آپؐ جو خواب دیکھتے وہ چند دنوں بعد یا اگلے ہی دن وہ واقعہ کی صورت میں ظہور پذیر ہو جاتا۔ اسی بات کو ایک حدیث میں ''مثل فلق الصبح'' (صبح صادق کی پو پھٹنے کی مانند) قرار دیا گیا ہے۔